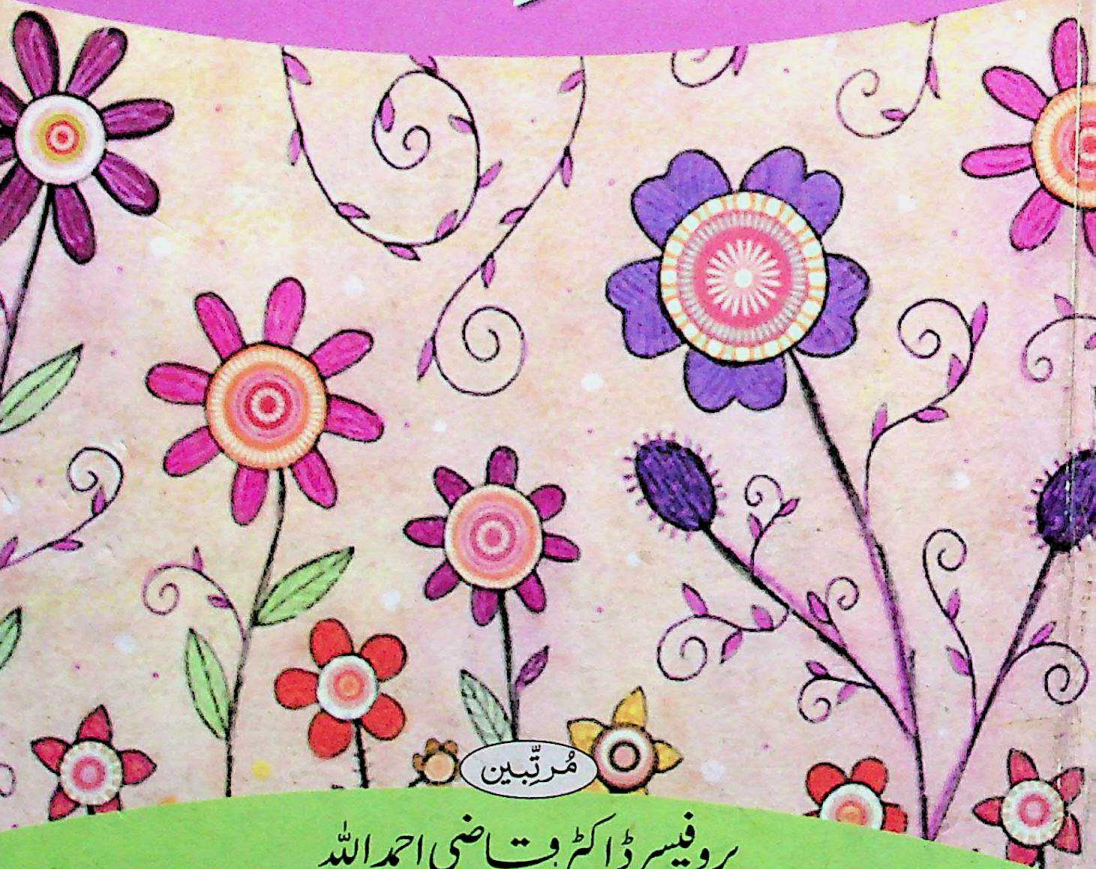


گلدستہ اردو تدریس

برائے

متعلمین بی۔ایڈ



مُرتَبین

پروفیسر ڈاکٹر بتاضی احمد اللہ
(پرنسپل رحمت عالم کالج آف ایجوکیشن، انت ناگ)

پروفیسر شیخ محمد یوسف

گلدستہ اردو تدریس

برائے

متعلمین بی۔ایڈ



G.M. College of Education
Raipur, Bantalab
Jammu.

Acc. No... ۱۵۷۶۶۷

Dated... ۳۰-۱-۲۰۱۶ مرتبین

پروفیسر ڈاکٹر فتاحی احمد اللہ
(پرنسپل رحمت عالم کالج آف ایجوکیشن، انت ناگ)

پروفیسر شیخ محمد یوسف
(صدر شعبہ اردو، رحمت عالم کالج آف ایجوکیشن، انت ناگ)

© جملہ حقوق بحق مرتبین محفوظ ہیں

نام کتاب : گلدستہ اُردو تدریس
برائے : متعلمان بی۔ ایڈ
مُرتبین : پروفیسر ڈاکٹر قاضی احمد اللہ
پروفیسر شیخ محمد یوسف
سال اشاعت : 2014ء
سائز : 23x36/16
صفحات : 320
قیمت : 300 روپے
کمپیوٹر کمپوزنگ : TFC سنٹر گاؤ کدل سرینگر 2473818
طباعت : الحیات پرنٹنگرافرس سرینگر 9419403126

Guldsta-e-Urdu Tadrees

by

*Prof.(Dr.) Qazi Ahmad Ullah
Prof. Sheikh Mohammad Yusuf*

ISBN : 978-81-924010-9-6

Published by :

TAKBEER PUBLICATIONS

Srinagar (Kashmir)

Cell : 9906662404

مشمولات

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
05	پیش لفظ..... از: مرتبین	01
09	یونٹ (I) باب اول (اُردو کا مقام و منصب)	02
11	اُردو زبان کا آغاز و ارتقاء، تدریس اُردو کے اغراض و مقصد	
	(پرائمری و ثانوی سطحوں پر)	
35	ایک اچھے اُردو معلم کے اوصاف، اُردو پڑھانے کی مشکلات	
55	یونٹ (II) باب دوم (طریقہ ہائے کار یا اُردو پڑھنے کے طریقے)	03
57	طریقہ ترجمہ یا طریقہ گرائمر، طریقہ راست، کھیل کھیل طریقہ، ساختی	
تا	طرز یا بناوٹی طرز، ترسیلی یا ابلاغی طرز، دولسانی یا دوزبانی طریقہ،	
96	منتخب طرز نظر یا مخلوط طریقہ	
97	یونٹ (III) باب سوم (لکھائی اور پڑھائی)	04
99	پڑھنا، خوش خوانی کے اصول، گہرا مطالعہ، سرسری مطالعہ، موازنہ گہرا	
	مطالعہ اور سرسری مطالعہ، مطالعہ بالجہر (بلند خوانی) خاموش مطالعہ	
	(خاموش خوانی) تحریر کی اہمیت و افادیت، اُردو رسم الخط کی بنیادی	
تا	جانکاری، خط نسخ، خط نستعلیق، خط شکستہ، عربی، فارسی اور ہندی	
	زبانوں سے مستعار لئے گئے حروف، خوش نویسی کے اوصاف، لکھنے	
	کی مہارت میں خامیاں اور اُن کی بہتری کے لیے اصلاح، مضمون	
160	نویسی، مطالعہ کے اصول۔	

161	یونٹ (IV) باب چہارم	05
163	تدریس نثر و نظم و اندازہٴ قدر/ جانچ اور تدریس خُرد تدریس۔ اقداماتِ درس۔ طریقہ تدریس زبان اردو و مقاصد تدریس اردو۔ تحتانوی درجوں کے لیے تدریسی اشارات و منصوبہ بند سبق (ابتدائی درجوں کے لیے) منصوبہ تدریس نثر، منصوبہ تدریس نظم، مائیکرو ٹیچنگ (خُرد تدریس)۔ فسر ق مابین خُرد تدریس و کلان تدریس۔ نمونہ منصوبہ درس خُرد تدریس (تمہیدی مہارت) Set Inductional نمونہ منصوبہ درس خُرد تدریس۔ محرک بدلنے کی مہارت (Set Variation)، نمونہ منصوبہ درس خُرد تدریس، ہمت افزائی مہارت (Re-Inforcement)، نمونہ منصوبہ درس خُرد تدریس، سوال پوچھنے کی مہارت (Probing) (Questioning) نمونہ منصوبہ درس خُرد تدریس، تختہ سیاہ استعمال کرنے کی مہارت (B.B. Skill)، نمونہ منصوبہ درس خُرد تدریس، مجموعی مہارتیں (Skill of Integration) اندازہ قدر/ جانچ کا تصور اور معنی خطا تجزیہ اور اصلاحی تدریس، اچھی زبان فہمی آزمائش کا معیار زبان فہمی آزمائش کی قسمیں	230
231	یونٹ (V) پانچواں باب	06
233	علی گڑھ تحریک کے علمی اور ادبی کارنامے ترقی پسند تحریک اردو شاعری کے دبستان، دبستان دہلی و لکھنؤ، اردو ناول، اردو، ناول، افسانہ، انشائیہ، داستان، ڈراما، ڈراما کی تدریس، نثر اور اس کی قسمیں، حروف شمسی و حروف قمری، اردو، تلفظ کی تدریس۔ سیلیس تدریس اردو، برائے بی ایڈ کلاس کشمیر یونیورسٹی	312
313	کتابیات	07
315	بی ایڈ کلاس کے لیے پچھلے چند برسوں کے تدریس اردو کے کچھ سوالنامے (Question Papers).	08
320		

پیش لفظ

عمل تدریس نہایت ہی مشقت طلب ہے۔ کچے ذہنوں میں پکے عقوش ڈالنا اور ان پر دیدہ زیب عمارت کھڑا کرنا مسلسل عرق ریزی، خلوص اور جانفشانی کا متقاضی ہے۔ یہ عمارت کھڑی ہونے کے لیے جسمانی طاقت کے استعمال سے کم اور تخلیقی کاوشوں سے زیادہ کاہنر چاہتی ہے۔ تجربہ اور شغفِ عمل اس پر ایسا ہی ہے، جیسے سونے پر سہاگا۔ جب اس میں مشنری سپرٹ ہو تو یہ عبادت بن جاتا ہے۔

چونکہ ہر زمانے میں انسان اپنے تجربات اپنی آنے والی نسل تک منتقل کرنے کا متمنی رہا ہے۔ اس ضمن میں اپنی کاوشوں اور صلاحیتوں کو جھونک دیا ہے، ہرگز رتی پیڑی کے ساتھ اس میں اپنے حاصل شدہ تجربے کو شامل کرتا گیا ہے؛ اپنے سابقہ علم کو جدید علم کے ساتھ ضم کرتا گیا ہے اور نتائج کی جانچ کے ساتھ ہی تکمیل کا خواہاں رہا ہے اس لیے عمل تدریس کے میدان میں نئے نئے تجربات ہوتے رہے، نئے نئے نظریات پیش کئے جاتے رہے اور ان کی پرکھ ہوتی رہی۔ ساتھ ہی ساتھ عملی میدان میں ان سے کام بھی لیا جاتا رہا۔ یہ عمل ہنوز جاری و ساری ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس مفید عمل کو آگے بھی جاری نہ رکھا جائے کیونکہ

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھئے کہ ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں
(الطاف حسین حالی)

آج جو صورت حال ہے اُس کے تقاضوں کی برآمدگی کے لیے عمل تدریس کو ایک باقاعدہ علم کی حیثیت دی گئی ہے اور اس کے لیے بہت سارے نظریات پیش کئے گئے

ہیں۔ ہر نظریہ مخصوص حالات اور مخصوص ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ ان نظریات کے مثبت پہلو بھی ہیں اور کچھ بظاہر منفی پہلو ہیں۔ مثبت پہلو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور بھی گہرے ہوتے جاتے ہیں اور منفی پہلو عمل کی سان پر چڑھ چڑھ کر اپنی تیج کھو بیٹھتے ہیں۔ اس طرح عمل تدریس بالآخر مستفید ہوتا جا رہا ہے۔

ان تدریسی نظریات کو میدان درس میں عمل لانے والے ہاتھ اساتذہ کے ہیں۔ جب تک خود اساتذہ ان نظریات؛ ان کے فنی پہلوؤں؛ ان کے عمل لانے کے طریقوں؛ ان کے نتائج کو جانچنے کے اصولوں؛ حاصل شدہ نتائج کو ثبت کرنے کی تکنیک وغیرہ سے بخوبی شناسائی اور ٹریننگ حاصل نہ کریں، یہ نظریات کتابی اوراق سے منتقل ہو کر کلاس روم کی سطح تک نہ آسکیں گے۔ اسی غرض سے بی۔ ایڈ کورس ترتیب دیا گیا ہے اور اس کورس کی پڑھائی، سکھائی، عمل آوری اور عملی میدان میں تربیت دینے کے لیے بی۔ ایڈ کالجوں کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔

ان معلم اساتذہ کو کس نہج پر تعلیم دی جائے، ان کی تربیت کیسے ہو، ان کو عملی میدان میں کب، کتنی دیر تک اور کس نظم کے ساتھ تربیت دی جائے اور ان کے خود کی جانچ پرکھ کیسے ہو، اس کے لیے باقاعدہ سلیبس مقرر کیا گیا ہے۔ تجربہ یافتہ اساتذہ اور اسکا لر نے ان کی مدد کے لیے کتب اور دیگر معاون لٹریچر تیار کیا ہے، جس سے ان زیر تربیت اساتذہ کی بڑی حد تک رہنمائی ہوتی ہے اور ان کو درسی مواد حاصل کرنے میں خاصی سہولیت ہوتی ہے۔

البتہ جہاں تک اُردو زبان اور اس کی تدریس کا تعلق ہے تو اس کے لیے معاون کتب کی کمی بے حد کھلتی ہے۔ بہت کم لوگوں نے اس طرف اپنی توجہ مبذول کی ہے۔ جو بھی کتب دستیاب ہیں وہ بی۔ ایڈ میں زیر تعلیم طلباء کی ضروریات کی پوری طرح کفیل نہیں ہیں۔ خاص کر جب ہم دیکھیں کہ وہ کشمیر یونیورسٹی کے متعین کردہ سلیبس کا پوری طرح احاطہ ہی نہیں کرتیں۔ یہی وجہ ہے کہ طلباء سال بھر

پریشان رہتے ہیں اور نوٹس وغیرہ بنانے اور حاصل کرنے میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ایسے نوٹس بسا اوقات معیاری بھی نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امتحان میں ان کی کارکردگی پر ناموافق اثر پڑتا ہے۔

اس حقیقت کا ادراک رحمت عالم کالج آف ایجوکیشن انٹرنیٹ ناگ کے منتظمین اور شعبہ اُردو سے وابستہ پروفیسر صاحبان کو پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اُردو کو بطور اختیاری مضمون لینے والوں کی تعداد اب پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ دوسرے کالجوں میں بھی کم و بیش یہی صورتحال ہے۔ اس وجہ سے زیردرس اساتذہ کی طرف سے مطالبہ بڑھتا ہی گیا کہ ہم ان کے لیے ایک ایسی کتاب ترتیب دیں جو مفصل و مدلل بھی ہو، ان کے تقاضے پوری کرتی ہو اور بی ایڈ کے مقررہ نصاب کا احاطہ بھی کرتی ہو۔ یہ کام اگرچہ بہت ہی محنت طلب تھا مگر طالب علموں کے معصومانہ اصرار کے سامنے مرتبین کی مجبوریوں کو پسپائی اختیار کرنی پڑی۔

اس کتاب کے مرتبین نے حتی الوسع کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں ہر وہ ضروری مواد شامل کیا جائے جو تدریس اُردو کے سلسلے میں لازمی ہے۔ نہ صرف تھیوری کی وضاحت ہو بلکہ لیسن پلان، نمونہ درس، تدریس خُرد وغیرہ حصوں کو شرح و بسط کے ساتھ سادہ، سلیس اور عام فہم زبان میں پیش کیا جائے۔ کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے مقرر کردہ بی۔ ایڈ تدریس اُردو کے لیے نصاب کی ضرورتوں کو بطور خاص ملحوظ نظر رکھا گیا ہے۔ ایسا کرنے میں مرتبین کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، اس کا اندازہ قارئین کی قیمتی آراء سے ہم کو ہو سکتا ہے۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ یہ آراء ہم تک ضرور آئیں گی اور ان کی روشنی میں ہم اس کے آئندہ ایڈیشن کو اور زیادہ بہتر بنانے کی سعی کریں گے۔

اس کتاب کی ترتیب میں ہمیں اپنے کالج کے قابل پروفیسر صاحبان کے مشورے ہمیشہ میسر رہے ہیں اور ان کی اعانت ہمارے حوصلے بڑھانے میں مدد و معاون ثابت ہوئی ہے، خاص طور پر ہم جناب پروفیسر محمد عبداللہ بٹ صاحب

کے شکر گزار ہیں، جنہوں نے اپنے تجربے کی بنیاد پر بہت ہی مفید مشوروں سے ہمیں نوازا ہے۔

ناسپاسی ہوگی اگر ہم کالج کے ڈائریکٹر جناب پروفیسر غلام نبی صدیقی صاحب اور ایڈمنسٹریٹر جناب حکیم محمد خلیل صاحب کی شفقت، حوصلہ افزائی اور رہنمائی کے لیے ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا نہ کریں۔ اللہ ان سب کو جزائے خیر دے اور اس کتاب کے مرتب کرنے میں جو جذبہ، نیت اور خلوص کا رفرما ہے، اس کے لیے مرتبین کو بھی اپنی عنایتوں سے نوازے۔ (آمین)۔ ع

”گر قبول اُفتدز ہے عز و شرف“

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مُرتَبِّین

پروفیسر ڈاکٹر فاضل احمد اللہ

(پرنسپل رحمت عالم کالج آف ایجوکیشن، انت ناگ)

پروفیسر شیخ محمد یوسف

(صدر شعبہ اُردو، رحمت عالم کالج آف ایجوکیشن، انت ناگ)



UNIT I

Position of Urdu

یونٹ (۱) پوزیشن آف اُردو

پہلا حصہ۔ پہلی اکائی

”اُردو کا مقام و منصب“

ہند میں اُردو، وہ ایک خوش رنگ پودا ہے
جسے خونِ جگر سے ہندو مسلم نے سینچا ہے
جگن ناتھ آزاد

اُردو زبان کا آغاز و ارتقاء

اُردو زبان کی ابتداء اور اس کی نشوونما کے بارے میں مختلف اور متضاد باتیں کہی گئی ہیں۔ مبتدی کے لیے کسی نتیجے پر پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مختلف نظریات جو اردو کی ابتداء کے بارے میں پیش کئے گئے ہیں۔ ذہن کو الجھاؤ میں ڈال دیتے ہیں۔

”شد پریشان خواب من از کشرت تعبیر ہا“

کا مصداق پیش کرتے ہیں۔

زبانیں کسی لگے بندھے اصول کے تحت نشوونما نہیں پاتیں بلکہ ان پر حالات و واقعات کے مختلف دھارے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور زبان کی ہیئت کو تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ قوموں کا عروج و زوال، سیاسی ماحول، تہذیبی اور تمدنی عوامل، مختلف زبانیں بولنے والوں کا رابطہ سب ہی زبان کی ساخت و پرداخت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی لیے تاریخ زبان سے متعلق مختلف رائیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اُردو، ادب کے طالب علم کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ اردو زبان کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں جانکاری حاصل کرے۔ جیسا کہ دوسری زبانوں کے ساتھ معاملہ ہے اسی طرح اُردو زبان کے عالموں نے اس کی ابتداء و ارتقاء کے ضمن میں مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ طوالت سے بچنے کے لیے صرف چند آراء پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اُردو کے مشہور انشا پرداز اور محقق محمد حسین آزاد نے اُردو کی بنیاد برج بھاشا پر

رکھی۔ وہ ”آب حیات“ کا آغاز ہی اس جملے سے کرتے ہیں۔
 ”اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے
 اور برج بھاشا خالص ہندوستانی زبان ہے۔“

وہ مقدمہ ”آب حیات“ میں ان عناصر کا اجمالی جائزہ لیتے ہیں جن کے اثر
 سے برج بھاشا نے رنگ بدلا اور اردو کی شکل اختیار کی۔ ان تبدیلیوں کو وہ فارسی کی
 طرف منسوب کرتے ہیں۔ گویا بھاشا میں فارسی کا پیوند لگا تو اردو وجود میں آئی۔
 ان کی بحث کا لب لباب انہیں کے الفاظ میں یہ ہے۔

”اردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اُگا مگر فارسی کی
 ہوا میں سرسبز ہوا ہے۔“

میرامن اپنی تصنیف ”باغ و بہار“ کے دیباچے میں اردو زبان کی پیدائش
 کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اردو، اکبر کے عہد
 میں پیدا ہوئی اور شاہ جہاں کے زمانے میں اس نے فروغ پایا۔

برج بھاشا اور اردو کا رابطہ حقیقتاً اکبر کے زمانے (۱۵۵۶ء-۱۶۰۵ء) سے
 شروع ہوا۔ اس زمانے کی دیگر تصانیف کے علاوہ قطب شاہی دور (۱۵۱۲ء-
 ۱۶۸۷ء) کی تصانیف اردو کی قدامت کا واضح ثبوت مہیا کرتی ہیں۔

محمود شیرانی کا خیال ہے کہ اردو کی داغ بیل پنجاب کے علاقے میں پڑی۔
 انہوں نے اپنی تحقیق کی بنیاد ان ٹھوس تاریخی حقائق پر رکھی جو مسلمانوں کی
 ہندوستان میں آمد کے بعد پیش آئے۔ شیرانی لکھتے ہیں:

”سندھ و پنجاب میں ہندو مسلم اقوام سب سے پہلے ملتی جلتی ہیں۔“

اس لیے اگر انہیں ایک عام زبان کی ضرورت ہوئی تو ان ممالک
 میں پیش آئی ہوگی اور اردو کو ان ممالک میں وجود میں آنا چاہیے۔“

مولانا سید سلیمان ندوی اردو کے ابتدائی آثارِ مسلمانوں کی فتحِ سندھ کے وقت سے تلاش کرتے ہیں۔ تفصیلی بحث کے بعد وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ”قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولی اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا“۔ وہ اس خیال کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ ”یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ وار زبانوں سے مل کر ہر صوبے میں الگ الگ پیدا ہوئی“۔ یہ بیان بڑا ہی مذہب اور غیر تسلی بخش ہے اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا مشکل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اردو کی صورت اس وقت نکھرنی شروع ہوئی جب مسلمانوں نے اس سرزمین پر قدم رکھا اور اس ملک کے باشندوں سے ان کا میل جول بڑھا۔ یہ واقعہ تقریباً ۱۰۰۰ء کا ہے۔ مسلمان اس سے پہلے ہندوستان آنے لگے تھے۔ قاعدہ ہے کہ مختلف زبانیں بولنے والی قومیں جب ایک دوسرے سے ملتی اور لین دین کرتی ہیں تو ایک نئی زبان کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ ڈاکٹر سنی کمار چٹرجی کا خیال ہے کہ ”اگر مسلمان ہندوستان میں نہ آتے تو جدید ہند آریائی زبانوں کے ادبی آغاز و ارتقاء میں دو ایک صدی کی ضرورت تاخیر ہو جاتی“۔

مسلمانوں میں محمد بن قاسم کا ۱۲ء میں سندھ و ملتان کو فتح کرنا۔ محمود غزنوی کا ۹۹۷ء اور آل محمود کا سندھ و ملتان اور پنجاب سے لے کر میرٹھ اور نواحِ دہلی تک کے علاقوں پر حکومت کرنا، محمد غوری کا ۱۱۹۳ء میں دہلی کو فتح کر کے پایہ تخت بنانا۔ قطب الدین ایبک کا ۱۲۰۶ء میں شمالی ہند میں آزاد حکومت قائم کرنا۔ علاؤ الدین خلجی کا دکن و گجرات پر قبضہ کرنا پھر محمد بن تغلق کا سلطنت دہلی پر ۱۳۲۵ء میں تخت نشین ہونا اور پھر دہلی کے بجائے دولت آباد (دیوگری) کو اپنا پایہ تخت قرار دینا اس کے بعد مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر کا مغل سلطنت کی بنیاد ڈالنا بڑی اہمیت رکھتے

ہیں۔ دکن و شمالی ہند میں جہانگیر کی وفات تک یہ زبان آزادانہ طور پر پھلتی پھولتی رہی لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کے زوال کی ایک طویل داستان شروع ہوئی ہے۔ یہی زمانہ اردو کے مکمل ارتقاء اور پورے عروج کا زمانہ ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں فارسی کا زوال بھی شروع ہوا۔ فارسی کے روبرو زوال ہوتے ہی شمالی ہند میں اس گری پڑی زبان کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور مختلف مقامی اور غیر مقامی لسانی دھاروں کے امتزاج سے زبان کی جو نئی شکل وجود میں آئی وہ شروع شروع میں ہندی، ہندی یا ہندوستانی کہلائی جو بعد میں ریختہ پھر اردو کے نام سے رائج ہو گئی۔

حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے کوئی ڈیڑھ ہزار برس پہلے آریہ ہندوستان میں داخل ہوئے۔ اُس وقت یہاں دراوڑ قوم آباد تھی۔ آریوں کے ہاتھوں اس قوم کو شکست ملی اور دراوڑوں کی بڑی تعداد نے دکن میں پناہ لی۔ شمالی ہندوستان پر آریہ قابض ہو گئے لیکن دراوڑوں کی اچھی خاصی تعداد بھی یہاں باقی رہی۔ اس طرح دونوں اقوام کا آپس میں لفظوں کا لین دین ہوا۔ آریوں کی زبان خالص نہ رہی۔ انہوں نے اپنی زبان کو مقامی بولیوں کے الفاظ سے پاک کر لیا۔ مقامی اثرات سے پاک و صاف ہو کر ایک معیاری زبان وجود میں آئی جس نے سنسکرت (شستہ) نام پایا۔ جو کہ بعد میں پنڈتوں کی جاگیر ہو کے رہ گئی اور ایک طبقے تک محدود ہو کر رہ گئی۔

آریائی کے ارتقائی دور کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) قدیم ہند آریائی (۲) درمیانی ہند آریائی (۳) جدید ہند آریائی

(۱) قدیم ہند آریائی: یہ دور تقریباً ایک ہزار سال پر محیط ہے اور ۵۰۰ ق م پر ختم

ہو جاتا ہے۔ اس عرصے میں آریہ مغربی علاقوں سے مشرقی علاقوں کی طرف پیش

قدمی کرتے ہوئے بنگال تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح آریائی زبان یہاں کی مقامی زبانوں اور علاقائی اثر سے تبدیل ہونا شروع ہوئی۔ یہ اثر پیش نظر رکھتے ہوئے زبان کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

(۱) پراچیہ (۲) مدھیہ (۳) ادیچہ

پراچیہ: انتہائی مشرق میں اصل سے دور ہونے کے باعث کم درجہ خیال کی جانے لگی۔

مدھیہ: ابتداء میں مدھیہ (وسطی علاقے میں بولی جانے والی زبان) کو بھی کم درجہ خیال کیا گیا لیکن جوں جوں وسطی علاقے کو سیاسی اہمیت حاصل ہوتی گئی۔ اس زبان کی قدر و منزلت بھی بڑھ گئی۔

ادیچہ: مغربی زبان تھی جو اصل زبان سے قریب تر رہی۔
لسانی اعتبار سے زبان تین ادوار میں تقسیم کی جاسکتی ہے:
(۱) رگ وید کی زبان جو قدیم ترین زبان ہے۔

(۲) دیگر ویدوں کی زبان جو رگ وید کے مقابلے میں زیادہ شائستہ اور شستہ

ہے۔

(۳) ادبی سنسکرت جو عالموں کی زبان بنی۔

درمیانی ہند آریائی دور

اس میں ۵۰۰ ق م سے ۱۰۰۰ء تک کا زمانہ شامل ہے۔ سنسکرت کے پہلو بہ پہلو جو عوامی بولیاں رائج تھیں ان کو ”پراکرت“ کا نام دیا گیا۔ جس کے معنی ہیں فطری بولی۔ اس دور کی پراکرتوں کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) پشاجی (۲) شورسینی (۳) مہاراشٹری (۴) ماگدھی (۵) اردھ ماگدھی

پشاپچی: یہ زبان پنجاب اور کشمیر کے علاقے میں بولی جاتی تھی۔ اسے بھوت پریت کی زبان کہا گیا۔ اس زبان میں ہند آریائی اور ہند ایرانی دونوں کے اثرات شامل ہیں۔

شورسینی: پہلی صدی عیسوی میں ہی اس نے ادبی شکل اختیار کی۔ اس پر سنسکرت کی گہری چھاپ ہے۔ اس کا مرکز متھرا کا علاقہ تھا۔
مہاراشٹری: یہ پراکرت جنوبی علاقے میں رائج تھی۔ ادبی حیثیت سے اسے عروج حاصل ہوا۔ ادبی سنسکرت سے مشابہ ہے۔

ماگدھی: مگدھ دیش (بہار) کی زبان تھی۔ مرکزی علاقوں سے دوری کے باعث اسے زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی اور اسے غیر مہذب زبان خیال کیا گیا۔
اُردھ ماگدھی: شورسینی اور ماگدھی کے درمیانی علاقے میں رائج تھی۔ یہ ایک ملی جلی اور کچھڑی زبان تھی۔

جدید ہند آریائی دور

اس کا زمانہ ۱۰۰۰ء سے شروع ہوتا ہے اور تاحال جاری ہے اس دور کی زبانوں کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) شمال مغربی گروہ (ب) وسطی گروہ (ج) مشرقی (د) جنوبی (ہ) شمالی

شمال مغربی گروہ اس میں اہند اور سندھی زبانیں شامل ہیں۔

وسطی: اس میں مغربی ہندی پنجابی، راجستھانی، گجراتی اور پہاڑی بولیاں

شامل ہیں۔

مشرقی: اس میں مشرقی ہندی، اڑیا، بنگالی اور آسامی زبانیں شامل ہیں۔

جنوبی: مہاراشٹری اور اس کی بولیاں شامل ہیں۔

شمالی: اس میں نیپالی اور دوسری پہاڑی زبانیں شامل ہیں۔

اردو کی ابتداء سے متعلق بحث میں سر زمین سندھ و پنجاب کے علاوہ کھڑی بولی ہریانی اور برج بھاشا کے نام سامنے آتے ہیں۔ انہیں بولیوں سے اردو کا تعلق قائم کرنے میں نظریاتی اختلاف پیدا ہوئے۔ چنانچہ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے ”مقدمہ تاریخ زبان اردو“ لکھ کر تحقیق کے میدان کو اور وسعت دی اور اس رشتے کی تلاش میں دہلی کے گرد و نواح کی بولیوں ہریانی، کھڑی بولی اور راجستھانی کے اثرات کی کھوج کی۔ دہلی چونکہ ان تینوں بولیوں کے سنگم پر واقع تھی اس لیے ان کے اثرات کا مرتب ہونا ضروری تھا۔ پروفیسر شیرانی نے ہریانی کو اردو کی ہی ایک شکل قرار دیا تھا مگر مسعود صاحب اس کی تردید کر کے نہ صرف اسے ایک علیحدہ اور مستقل زبان قرار دیتے ہیں جو مضافات دہلی میں رائج تھی بلکہ وہ اسے پنجابی زبان کے مقابلے میں زیادہ قدیم بھی تصور کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کے وقت ہریانی اور پنجابی میں خط فاصل قائم کرنا دشوار تھا۔ قدیم اردو اور دکنی کا ”پنجابی پن“ اس کا ”ہریانی پن“ بھی ہے البتہ شورسینی۔ اُپ بھرنش کی جانشین ہونے کی حیثیت سے پنجابی زبان کے مقابلے میں ہریانی اور کھڑی بولی کو قدیم ماننا پڑے گا۔“

غرض مسعود صاحب نے تمام تر زور اس بات پر دیا ہے کہ اردو کی تہہ میں جو بولیاں ہیں وہ نواح دہلی کی بولیوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

ایک اور نظریہ ڈاکٹر شوکت سبزواری کا ہے آپ دو آبہ گنگ و جسمن کو اردو کا مسکن قرار دیتے ہیں۔ اور محی الدین قادری زور اردو پر ہریانی کے اثرات کو زیادہ

اہمیت دیتے ہیں۔

ان مختلف نظریات پر تنقیدی نظر ڈالنے سے بیشتر ضروری ہوگا کہ اُردو کے ان رشتوں پر بھی نظر ڈال لی جائے جو ان اختلافی مدارج سے بالاتر اور قدیم تر ہیں اور جس پر تقریباً سب ہی علماء کا اتفاق ہے وہ یہ کہ آج اردو زبان نے بین الاقوامی شہرت (International) حاصل کر لی ہے۔ برصغیر کے علاوہ دنیا کے مختلف ملکوں اور شہروں میں یہ زبان بولی جاتی ہے اور اردو میں مختلف ادبی تنظیمیں بھی قائم کی جا رہی ہیں۔

پروفیسر احتشام حسین نے اس زبان کے فروغ کا ایک اور اہم سبب بیان کیا ہے وہ یہ کہ مسلمان بادشاہوں نے اپنی سلطنت میں مال گزاری کا پرانا بندوبست ہی جاری رکھا۔ اس کے مطابق مال گزاری وصول کرنے کی ذمہ داری گاؤں کے مکھیا اور مقامی کارکنوں پر ہوتی تھی۔ اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کے سلسلے میں یہ لوگ مقامی زبان کا استعمال کرتے ہوں گے۔ لیکن فارسی اصطلاحوں سے بھی کام لینا پڑتا ہوگا۔ اس نئی زبان کو اس سے بھی تقویت پہنچی۔

اس زبان پر سب سے بڑا احسان بزرگانِ دین کا ہے۔ جنہوں نے اپنا پیغام عوام و خواص کے دلوں تک پہنچانے کے لیے اپنی وعظ و نصیحت کی مجلسوں میں اس کا استعمال کیا۔ شیخ فرید الدین گنج شکرؒ، خواجہ قطب الدین بخیار کاکیؒ وغیرہ۔ بزرگوں کی آپس میں گفتگو بھی اسی زبان میں ہوتی تھی کیونکہ یہی اس زمانے میں بات چیت کی زبان تھی۔ اس کے علاوہ یہ عوامی زبان مجالس وعظ میں بھی استعمال ہوتی تھی۔

خواجہ نظام الدین اولیاء کی تصانیف میں بھی مقامی الفاظ ملتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مقامی زبان میں دوہرے بھی کہے۔ ان کے مرید حضرت خواجہ امیر خسروؒ نے تو اردو زبان کی تشکیل میں نہایت اہم خدمت انجام دی۔

جس کی تصانیف اور شاعری دو ہے۔ مکر نیاں اور پہیلیاں وغیرہ اردو زبان کے عروج کا ثبوت ہیں۔ خسرو کا زمانہ خلجی اور تغلق خاندانوں کی حکومت کا زمانہ ہے۔ اس عہد میں فارسی زبان میں متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ یہی حال گورونانک اور کبیر کے کلام کا ہے۔ یعنی اس میں فارسی اور عربی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ گویا آپس میں لفظوں کا لین دین ہو رہا تھا اور کچھڑی زبان وجود میں آرہی تھی۔ اس نئی زبان کی ترقی میں ایک اور بات کو بہت دخل تھا۔ دلی کی فوجوں میں مختلف علاقوں کے لوگ ملازم تھے۔ ان میں ہندو بھی شامل تھے اور مسلمان بھی۔ یہ لوگ آپس میں بات چیت کے لیے صرف وہی زبان استعمال کر سکتے تھے جو دلی اور اس کے قرب وجوار میں بولی جاتی تھی۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس علاقے میں کھڑی بولی کا چلن تھا۔ یہ بھی طے شدہ ہے کہ اس بولی پر ہریانی، پنجابی اور برج کے اثرات موجود تھے۔ اور یہ بھی کہ اس زبان میں دوسری زبانوں کے لفظ برابر شامل ہوتے جاتے تھے۔ یہ فوجیں بالعموم حرکت میں رہتی تھیں جس سے اس ملی جلی زبان کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا تھا۔ اس طرح اردو زبان دلی اور نواحی اضلاع میں پھیلی پھولی۔ فوجی دستوں کے ساتھ یہ زبان دکن پہنچی۔ اس طرح یہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے یعنی (۱) قدیم اردو دکن میں اور (۲) قدیم اردو شمالی ہند میں۔

دلی کی یہ زبان دکن پہنچ کر زبانوں کے اجنبی ماحول میں ایک علیحدہ ڈگر پر پختی رہی ہے۔ دکن میں اس کا پہلا مرکز دولت آباد تھا۔ بہمنی سلطنت کے قیام کے ساتھ دکن کا مرکز کنڑی علاقے میں گلبرگہ منتقل ہو گیا تھا۔ سلطنت بہمنیہ کے ٹکڑے ہو جانے پر دکن میں دو مرکز پیدا ہو گئے ہیں۔ تلنگنی علاقے میں گولکنڈہ اور کنڑی علاقے میں بیجا پور، کئی ادب انہی دو مرکزوں میں اپنے کمال کو پہنچا ہے اور دلی کی

ناپختہ زبان نے نقلی قطب شاہ، وجہی اور نصرتی کے ہاتھوں ادبی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ دکن کے برخلاف شمالی ہندوستان میں یہ نئی زبان بہت تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرتی نظر آتی ہے۔ یہاں فارسی بولتے ہوئے قافلے مسلسل چلتے آتے ہیں۔ اور فارسی الفاظ تیزی کے ساتھ بول چال کی اس زبان میں داخل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ شمالی ہندوستان میں لسانی تبدیلی کی رفتار تیز رہتی ہے اور یہ زبان زیادہ صاف ہو جاتی ہے۔ بڑا دلچسپ تضاد ہے کہ اس زبان کو شاہی سرپرستی دکن میں حاصل رہی۔ شمالی ہند میں اسے گری پڑی زبان سمجھا جاتا رہا مگر اس پر نکھار یہیں آیا۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ ولی کا سفر دہلی ان کی شاعری میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ غرض یہ کہ ہندوستان میں ایک ایسی زبان کی بنیاد پڑ چکی تھی جسے ملک کے بڑے حصے میں سمجھا جاتا تھا۔

۱۵۲۶ء میں بابر نے ”ابراہیم لودھی“ اور ”رانا سائگا“ کو شکست دے کر ہندوستان میں ایک مستحکم حکومت قائم کر دی جس کی حدود پھیلتی چلی گئیں اور اس عوامی زبان کو دور تک پھیلنے اور پھلنے کا موقع ملا۔

اکبر اعظم کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے اس زبان کو اتنی اہمیت حاصل ہو گئی تھی کہ آئین اکبری میں ابوالفضل اسے ”زبان ہندی“ کے ساتھ ”زبان وقت“ اور ”زبان روزگار“ کے ساتھ یاد کرتا ہے۔ اورنگ زیب کے عہد میں (۱۶۵۷ء۔ ۱۷۰۷ء) میں اکثر مکتبوں اور مدرسوں کا ذریعہ تعلیم اردو زبان نظر آتی ہے۔ اسی زمانے ۱۷۰۰ء میں ولی اور پھر ۱۷۱۹ء میں خود ان کا دیوان دلی پہنچے۔ یہاں کی زبان کو ولی نے اپنی زبان سے زیادہ صاف پایا اور اسی کا اثر قبول کیا۔ اردو زبان کی ترقی کے لیے راستہ ہموار ہو گیا اور فارسی اس کے راستے سے ہٹ گئی۔

اردو زبان و ادب کا دورِ عروج

اردو زبان و ادب کی ترقی کا باقاعدہ آغاز اسی دن ہو گیا تھا جس دن شعرائے دہلی کلامِ ولی سے پہلی بار روشناس ہوئے تھے۔ اور انہیں احساس ہو گیا تھا کہ یہ کج محج زبان بھی اس قابل ہے کہ اس میں شاعری کی جائے۔ چنانچہ شاہ حاتم، شاہ مبارک آبرو اور مرزا مظہر جان جاناں جیسے بلند پایہ شعراء اس طرف متوجہ ہوئے۔ اس کے بعد شاعری کے سنہری دور کا آغاز ہوا۔ اس دور میں میر، سودا اور درد نے اردو شاعری کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔

تاریخ کا ورق پلٹنے سے ملک میں آگ سی لگ گئی۔ کچھ ہی دنوں میں دنیا نے سن لیا کہ ہندوستان سے مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور کمپنی بہادر کا سکہ چلنے لگا۔ اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت شروع ہوئی جس سے ہمارے ملک، ہماری زبان اور ہمارے ادب پر گہرا اثر پڑا۔

ہوا یہ کہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستانی فوج نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ بغاوت میرٹھ سے شروع ہوئی اور اس کے مختلف حصوں میں پھیل گئی۔ مگر اس کی عمر زیادہ نہیں تھی کیونکہ ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کی شام تک دہلی پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ بہادر شاہ آخری مغل تاجدار تھے۔ اس پر طرح طرح کے ظلم کئے گئے۔ آخر کار اسے جلاوطن کر کے رنگوں بھیج دیا گیا۔ غریب الوطنی کی زندگی گزار کر یہیں اس نے دم توڑا اور یہیں کی خاک میں دفن ہوا۔ بغاوت منسوخ کرنے کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں پر بے پناہ ظلم کئے۔ مسلمان چونکہ بغاوت میں پیش پیش تھے اس لیے ان سے بطور خاص انتقام لیا گیا۔ ہزار ہا بے گناہ پھانسی کے تختے پر چڑھائے گئے۔ بے شمار لوگوں کی جاگیریں اور جائیدادیں

ضبط ہوئیں۔ بہتوں کو سرکاری ملازمتوں سے محروم کیا گیا۔ اس بغاوت کی پاداش میں مسلمانوں پر جو زیادتیاں کی گئیں ان کا ذکر مولانا فضل الحق اور منیر شکوہ آبادی کی تحریروں میں ملتا ہے۔ غالب کے خطوط سے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی سب سے زیادہ اور چشم دید تفصیل سرسید نے لکھی ہے۔ اپنی کتاب ”اسباب بغاوت ہند“ میں انہوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اس بغاوت کی اصل ذمہ داری خود انگریز افسروں پر تھی۔

بیدار و ادب کا آغاز

مسلمانوں کی بربادی نے جس شخص کو سب سے زیادہ بے قرار کیا اس کا نام سرسید احمد خان تھا۔ انہوں نے کوشش کی کہ مسلمانوں کو ان کا کھویا ہوا وقت اور پھر سے حاصل ہو جائے۔ اس سلسلے میں اصلاحی مہم کا آغاز کیا۔ انہوں نے اس اصلاحی پروگرام میں شعر و ادب کو شامل کیا۔ وہ با مقصد ادب کے قائل تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ شعر و ادب سے زندگی کو سنوارنے اور بہتر بنانے کا کام لیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی شاعر ایسی نظم لکھے جو قوم کو خواب سے بیدار کر سکے۔

آخر کار خواجہ الطاف حسین حالی نے ایک مسدس لکھ کر یہ خدمت انجام دی۔ سرسید اس نظم کو تو شہرہ آفرین سمجھتے تھے۔ نشر نگار وہ خود تھے۔ انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعے سوتوں کو جھنجھوڑا۔ اور قوم کے مردہ جسم میں زندگی کی لہر دوڑادی۔ انہوں نے ”سائنٹفک سوسائٹی“ قائم کی جس کا مقصد مفید کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنا تھا۔ رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کر کے انہوں نے اپنے اصلاحی مشن کو تقویت پہنچائی۔ انہوں نے اردو نثر میں جان ڈال دی کہ اردو زبان میں ہر موضوع پر علمی مضامین لکھے جانے لگے، اس لیے انہیں جدید نثر کا بانی کہا جاتا

ہے۔ سرسید کو دوست اور رفیق بھی ایسے میسر آئے جنہوں نے سرسید تحریک میں دل و جان سے مدد کی۔ اس طرح سرسید اور ان کے رفقاء کی کوششوں سے اردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اور شعر و ادب کا کاروان نئی منزلوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کارواں کا سفر جاری ہے۔

آخر پر جگن ناتھ آزاد کے اس شعر سے اردو زبان و ادب کی تاریخ کی وضاحت بحسن و خوبی واضح ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں ۔

ہند میں اُردو وہ ایک خوش رنگ پودا ہے
جسے خونِ جگر سے ہندو مسلم نے سینچا ہے

بنیادی اور ثانوی سطحوں پر اُردو پڑھانے کے اغراض و مقاصد

زندگی کے ارتقاء میں زبان نے جو کردار ادا کیا ہے وہ محتاج بیان نہیں اور زبان ترسیل خیالات کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ جس کے ذریعہ انسان دوسرے انسان کے ساتھ رابطہ قائم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: ”خلق الانسان علمہ البیان“ (سورہ الرحمن: ۳)

انسان دوسروں کے سامنے اپنے دکھ درد بیان کرتا ہے اور حالِ دل سناتا ہے۔ یہ کبھی اظہار خیال کا ذریعہ بنتی ہے اور کبھی اخفائے حال کا، کبھی نفرت کا زہر گھولتی ہے اور کبھی محبت کا جام پلاتی ہے۔ کبھی انقلاب کے راگ چھیڑتی ہے اور کبھی رومان کے نغمے الاپتی ہے۔ غرض اس کے بہت سے روپ ہیں۔

زبان اور فکر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کے ذریعہ انسان کے شعور کی تربیت ہوتی ہے اور تہذیب پر دان چڑھتی ہے۔ فکر زبان کی رہین منت ہے چونکہ زبان سیکھنا ایک اکتسابی عمل ہے اور یہ عمل ہمہ وقت نمودیر ہوتا ہے۔ چونکہ سماج

کے بغیر زبان سیکھنے کا تصور ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں جو مطالعے ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان بچوں میں زبان کی نشوونما نہیں ہو پاتی جو سماج سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ایسے بچوں کی ذہنی نشوونما رک جاتی ہے۔ لہذا زبان فرد اور سماج کے درمیان فعال رشتہ پیدا کرنے کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ

فسر د ف ت ائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے اندرون دریا بیرون دریا کچھ نہیں

جہاں تک زبان کا تعلیم سے تعلق ہے، بعض مفکرین کا خیال ہے کہ مدر سے کی تقریباً تمام تعلیم زبان ہی کی تعلیم ہے۔ یہاں تک کہ مدر سے کی پوری زندگی زبان کی تعلیم پر منحصر ہے۔ اگر زبان کی تعلیم ناقص ہو تو دوسرے مضامین کی تعلیم بھی نامکمل رہ جائے گی۔ مدر سے سے تمام مشاغل میں مہارت چاہیے نصابی ہوں یا غیر نصابی زبان ہی کے وسیلے سے پیدا ہوتی ہے۔ لہذا زبان کی تعلیم مدر سے کی زندگی کی ایک لازمی شرط ہے۔

مدارس میں ہم اسی مقصد کے حصول کی خاطر زبان پڑھاتے ہیں کہ زبان ہی ہمیں مہذب قوموں اور ملکوں کے علمی ذخیروں تک پہنچا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ زبان جس قدر صاف اور سلجھی ہوئی ہو اور جس قدر اس کا علمی اور ادبی مرتبہ بلند ہو اسی قدر تعلیم کا صحیح مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ چونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ وہی زبان موجودہ دور کے تمام تعلیمی تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے۔ جو ہر قسم کے الفاظ، خیالات، اصطلاحات اور علوم سے مالا مال ہو اور جس میں نئے الفاظ اور خیالات کو جذب اور قبول کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہو۔ اہل نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اردو زبان میں متذکرہ بالا ساری خوبیاں اور صلاحیتیں اس حد تک موجود ہیں کہ آج اس کا شمار دنیا کی زندہ زبانوں میں ہوتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اب تو یہ عالمگیر حیثیت

حاصل کر چکی ہے۔ اور اس کے مقام کو اقوام عالم نے تسلیم کیا ہے۔ اور قومی وحدت کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ ایک ایسا نمونہ جس میں مختلف قوموں، تہذیبوں اور زبانوں کا اتحاد نظر آتا ہے اور اس کا دامن جذباتی ہم آہنگی اور سیکولر روایات سے بھرا پڑا ہے۔ اور قومی دلی اور وطنی جذبات کی تہذیب و تربیت میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ اس کو نظر انداز کرنا حقائق سے چشم پوشی ہے۔

اس پس منظر میں اردو کی تدریس کے مقاصد بیان کرتے وقت یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مقاصد کا تعین ایک وسیع تناظر میں کرنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ ہمارے مدارس میں عام طور پر جس طرح اردو کی تدریس کا کام انجام دیا جاتا ہے وہ بڑی حد تک روایتی اور قدامت پسندانہ ہے۔ اس سے نہ تو طالب علم کے ساتھ انصاف ہوتا ہے اور نہ مضمون کے ساتھ۔ اس کو تاہی کا بڑا سبب یہ ہے کہ بچوں کی نفسیات، نصاب اور طریقہ تعلیم سے متعلق جو جدید تصورات اب تعلیمی دنیا میں کارفرما ہیں۔ وہ ہمارے مدارس میں موجود نہیں اور نہ مدرس ان میں تربیت یافتہ ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اردو تدریسی مقاصد کا تعین کرتے وقت ان جدید تصورات کو ملحوظ رکھا جائے۔

جہاں تک تعلیمی مقاصد کا تعلق ہے یہ وہ گوہر مقصود ہے جو کسی سوچے سمجھے طریقہ عمل سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے اور ان کا تعلق فرد کی پختگی، نشوونما اور انسانی رشتوں سے ہے اور یہ اغراض و مقاصد ایسے ہونے چاہئیں جو بیک وقت جماعتی احساس پیدا کریں اور انفرادی تقاضوں کی بھی تکمیل کریں۔

عام مقاصد: اچھا استاد ہمیشہ یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ قوم اور ملک کی اُن ننھی ننھی زندگیوں کو صحت مند قدروں پر ڈال دے اور انہیں اس قابل بنادے کہ وہ ایک صحت مند زبان کی مدد سے علم و فن کے موتی اپنے میں بھر سکیں۔

اور آئندہ زندگی ملک اور قوم کے ممتاز اور باوقار اور نیک شہریوں میں شمار ہو سکیں۔ اور یہ مقصد زبان کی صحیح تعلیم سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ زبان کی درست تعلیم ہی سے بچوں میں اظہار خیالات کی قوت اور فکر کا مادہ بڑھا کر انہیں اس مضمون کے علاوہ دوسرے مضامین میں بھی امتیازی مقام پالینے کے قابل بنا سکتی ہے۔ ان میں روانی، صفائی اور اعتماد کے ساتھ موقع اور محل کے مطابق مختلف موضوعات پر بولنے، بحث کرنے اور دوسروں تک اپنے خیالات پہنچانے کی صلاحیت پیدا کر سکتی ہے۔ اور اعلیٰ خیالات پیدا کر کے اعلیٰ سیرت تعمیر کر سکتی ہے۔ درست طریقہ پر سوچنے، بے لاگ فیصلہ دینے اور فکر و تخیل کی جولانیاں دکھانے کے قابل بنا سکتی ہے۔ زبان پڑھاتے ہوئے ہم علم و ادب کی شہہ پاروں کی مدد سے ان میں ششہ اور لطیف مذاق پیدا کر سکتے ہیں۔ اور انسان کائنات اور اس کے خالق کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ کر اپنے اندر بنی نوع انسان کے لیے محبت کا ایک آفاقی رجحان حاصل کرتا ہے اور اپنے تئیں ایک آفاقی انسان مفکر شیراز کے اس عالم گیر پیغام کو اپنا آدرش بنا لیتا ہے۔

بنی آدم اعضاءِ یک دیگرند
کہ در آفرینش ز یک جواہرند
چو عضوئے بدرد آورد روزگار
دگر عضو ہمارا نمائند فترار

استاد زبان کے لیے یہ لازمی بن جاتا ہے کہ وہ تعلیم زبان کے درج بالا مقاصد کو ذہن میں رکھ کر قومی نو نہالوں کی درست تعلیم و تربیت کا بیڑا اٹھائے۔ اور اس ضمن میں وہ طلبہ میں اس بات کا احساس پیدا کرے کہ اُردو ایک قومی زبان ہے اور اس رشتے سے انہیں اپنی قومی زبان سے محبت ہونی چاہیے۔ نیز طلبہ میں ایسی

عادت پیدا کریں کہ وہ اردو ادبیات سے شغف پیدا کر سکیں۔ اچھے اور برے ادب میں تمیز کر سکیں۔ اور اچھے ادب کے مطالعہ سے زندگی کے اعلیٰ قدروں کا عرفان حاصل کر سکیں۔ اور زبان و ادب کے ذریعے اپنے خیالات و جذبات کی تربیت کر سکیں۔ زبان کی تعلیم کا مقصد محض زبان پر قدرت حاصل کرنا نہیں بلکہ فرد کے نقطہ نظر میں وسعت پیدا کرنا بھی ہے۔ اردو چونکہ ہندوستان کی مخلوط زندگی کی آئینہ دار ہے اس لیے مشترکہ تہذیب کی اقدار کا استحسان کرنا بھی تدریس اردو کا ایک اہم مقصد ہے۔

مقاصد کا تعین کرتے وقت تعلیم کی ہر منزل کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ یعنی پرائمری، مڈل اور ثانوی، اعلیٰ ثانوی، فوقانی درجوں تک کا خیال رکھنا لازمی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان چاروں منزلوں کو یعنی پرائمری درجے پانچویں جماعت تک، چھٹی سے آٹھویں جماعت تک (وسطی درجے) نویں اور دسویں ثانوی درجے اور گیارہویں اور بارہویں جماعت اعلیٰ ثانوی جماعتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے تدریس اردو کے مقاصد کا تعین کیا جائے۔

پرائمری منزل یا بنیادی یا تحت ثانوی منزل

یہ منزل یعنی بنیادی درجوں سے پانچویں جماعت تک بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اور یہ کہ یہ بنیادی (Elementary) منزل ہے اور اس منزل پر جو لسانی عادتیں پیدا کی جائیں گی وہ بہت راسخ ہوں گی۔

دوم یہ کہ شخصیت کی نشوونما کی یہ ایک اہم منزل ہے۔ تعلیمی اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ طلباء کی بڑی تعداد پرائمری منزل کے اختتام پر تعلیم سے دست کش ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس منزل بروہ جو کچھ بھی حاصل کر لیں گے وہی خاص کر ان

کا سرمایہ حیات ہوگا۔

ان باتوں کے پیش نظر پرائمری یا بنیادی منزل پر اُردو کی تدریس کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

(۱) بولنا سکھانا: بولتا ہوا بچہ جب مدرسے میں آتا ہے تو ایک نئی دُنیا میں قدم رکھتا ہے۔ نئے ماحول، نئی فضا اور نئے چہروں سے اس کا سابقہ پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بولنے میں جھجک محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس لیے بغیر جھجک اور شرم و تکلف کے وہ فطری انداز میں بات چیت کر سکے۔ ان سے ٹکسالی زبان کی توقع یا مطالبہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں بے تکلفی اور برجستگی کے ساتھ اپنے انداز میں بے روک ٹوک اظہار خیال کا موقع دیا جائے اور رفتہ رفتہ انہیں بہتر بولنے کی تربیت دی جائے۔

بولنے اور سننے کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ اس لیے ابتدائی سطح پر بولنے اور سننے کی تربیت کے لیے ضروری ہے کہ درج ذیل صلاحیتوں اور مہارتوں پر زور دیا جائے۔

(i) تقریری آوازوں پر قدرت حاصل کرنا۔

(ii) بولتے وقت الفاظ کی صحیح ادائیگی کی صلاحیت پیدا کرنا۔

(iii) صحیح تلفظ کے ساتھ بولنے کی مشق کرنا۔

(iv) صحیح لب و لہجہ پر قدرت حاصل کرنا۔

(v) سامعین کی ضروریات اور دلچسپیوں کے پیش نظر فطری انداز سے بولنے کی عادت ڈالنا۔

(۲) پڑھنا سکھانا: صحیح بولنے کی بنیاد پر بچوں میں صحیح پڑھنے کی قابلیت پیدا کی جاسکتی ہے۔ بولنا سکھانے کے لیے بچے کے دواعضا زبان اور

کان کو نمایاں کام کرنا پڑتا ہے۔ لیکن پڑھنا سکھانے کے لیے اس کی نظر، زبان اور کان کو بیک وقت برابر کا رول ادا کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ ابتدائی جماعتوں میں نثر ہو یا نظم اونچی آواز میں پڑھنا اور بچوں سے پڑھانا بہترین نتائج پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح آگے چل کر ثانوی جماعتوں میں خاموش مطالعہ ایک بھاری اہمیت کا حامل بن جاتا ہے۔ غرض پڑھنا سکھانے کے لیے استاد کے لیے ضروری ہے کہ اُسے زبان کو اوپر بتائے گئے اشارے ذہن میں رکھ کر اپنی استادانہ صلاحیتوں سے کام لینا چاہیے تاکہ پڑھائی کی بنیادی مہارتیں پیدا کر دی جائیں۔ تاکہ طلباء صحت الفاظ، لُحْن اور روانی کے ساتھ عبارت پڑھ سکیں۔ اور مضمون کی تفہیم کر سکیں۔ اپنی معلومات میں اضافہ کر سکیں۔ جملوں کی ساخت اور ان کی مختلف شکلوں کی شناخت کر سکیں۔ اور نظم و نثر کا مطلب اور خلاصہ آسانی کے ساتھ بیان کر سکیں۔ لکھ سکیں اور دوسروں کو سنا اور سمجھا سکیں اور درسی کتب کے علاوہ نصاب سے باہر کوئی کتاب، رسالہ، اخبار، قلمی تحریر یا مطبوعہ عبارت پڑھ کر اس کا مفہوم اپنے الفاظ میں قلمبند کر کے دوسروں کو خوش اسلوبی کے ساتھ سنا اور سمجھا بھی سکیں۔

(۳) لکھنا سکھانا: صحیح لکھنا ایک فن ہے۔ استاد زبان اس فن کی تکنیک اور تقاضوں کو سمجھ کر ہی بچوں میں تحریر کی قابلیت پیدا کر سکتا ہے۔ بچوں کو لکھنا سکھاتے ہوئے اُستاد اصل میں اُن کے لیے دو بہت بڑے تعلیمی فائدوں کا اہتمام کرتا ہے۔ یعنی ایک تو انہیں فن تحریر کی تعلیم دے رہا ہوتا ہے۔ اور دوسرے اُن کی ہمہ گیر ذہنی نشوونما کا سامان بھی پیدا کرتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی اصول ہے کہ پڑھا ہوا سبق یا اس کا خلاصہ قلم کے ذریعے تختی یا کاغذ پر اتارنے سے بچے کا ذہن، اس کے نقوش آسانی کے ساتھ قبول کر لیتا ہے۔ آموختہ اسباق یا مضامین کو حافظے

میں محفوظ کرنے کا آسان، قدرتی اور سادہ طریقہ جو ہمیں فطرت نے بخشا ہے یہی

ہے کہ پڑھے ہوئے مضمون یا عبارت کو اپنے ہاتھ سے لکھا جائے اور لکھنے کی متواتر مشقیں دی جائیں تاکہ صحیح لکھنے کی قابلیت بھی بڑھ جائے اور پڑھا ہوا سبق بھی آسانی کے ساتھ ان کے ذہن نشین ہو جائے۔

جب بچے ثانوی جماعتوں میں آجائیں تو اسباق کی نقلیں اُتروانے، نظم و نثر کے مختلف مضامین کا خلاصہ اور مختلف اسباق سے متعلق سوالات کے جوابات قلمبند کرانے خطوط، مضامین اور کاروباری دستاویزات وغیرہ لکھانے سے اُن میں انشاء پر داری کی قابلیت پیدا کی جاسکتی ہے۔ اس کے برعکس شروع کے برسوں میں بس اس بات پر زور دینا چاہیے کہ طلباء جو کچھ لکھنا چاہیں، صفائی، سادگی اور روانی کے ساتھ لکھ سکیں۔

(۴) سمجھنا سکھانا: ابتدائی منزل لکھنا سکھانے کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ اپنے مشاہدات، خیالات اور احساسات کو صحت اور صفائی کے ساتھ تحریر کر سکیں۔ وہ تحریر گفتگو اور بول چال میں صفائی و سادگی اپنا کر نفس مضمون اخذ کر سکیں۔ اور فہم و ادراک اور حافظہ کی صلاحیت پیدا کر سکیں۔

غرض کہ پانچویں جماعت کے اختتام پر طلباء سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ زبان کی مہارتوں پر قدرت حاصل کر چکے ہوں گے اور ان میں یہ صلاحیت پیدا ہو چکی ہوگی کہ جو کچھ کہنا چاہیں صفائی کے ساتھ کہہ سکیں اور جو کچھ لکھنا چاہیں صفائی کے ساتھ لکھ سکیں۔ اور نظم بھی لطف اور تاثر کے ساتھ پڑھ سکیں۔

وسطانوی منزل: اس منزل پر طلباء کو چونکہ ادب سے متعارف کرایا جائے گا۔ اس منزل پر تدریس اردو کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ چونکہ طلباء پر انٹرمی منزل تک بنیادی مہارتوں سے روشناس ہوئے ہیں اب اس منزل میں عبارت پڑھ کر مطلب اخذ کرنے کے قابل بن جائیں اور آزاد

مطالعہ کی صلاحیت ان میں پیدا ہو جائے۔

۲۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق معلومات بہم پہنچانا اور پیشہ ورانہ امور میں استفادہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرانا۔

۳۔ شعر و ادب کے ذریعہ فطرت اور زندگی کا استحسان کرانا۔

۴۔ تقریر و تحریر کی بنیادی مہارتوں پر ایسی قدرت حاصل کرانا کہ وہ زبان کو صحت و صفائی اور شائستگی کے ساتھ تحریر و تقریر میں استعمال کر سکیں۔

۵۔ تلفظ، مطلب اور ساخت کے بارے میں بچوں کا قوت فہم بڑھانا۔ الفاظ کے فرق کو سمجھنا اور قواعد و صرف و نحو کے بارے میں واقفیت دلانا۔ جس سے زبان کا تجزیہ کرنا سیکھیں گے۔ اسی طرح بچوں کو ثانوی منزل پر ادبیات سے شغف پیدا کرنا مدرس کا کام ہے۔ اس منزل پر طلباء میں مختلف اصناف سخن اور اصناف ادب سے واقفیت پیدا کرنا سب سے بڑا مقصد ہے تاکہ وہ زبان کے حسن سے لطف اندوز ہو سکیں۔

حصول معلومات اور لطف اندوزی کے لیے مطالعے کی عادت میں استحکام پیدا کرنا اور زندگی کے اعلیٰ قدروں کا استحسان کرنا ثانوی منزل پر پڑھانے کا اہم مقصد ہے۔

مشاہرین ادب کے تخلیقی کارناموں سے واقف کرانا اور انہیں اس بات کے لیے اُکسانا کہ وہ اپنے ذوق کے مطابق خود بھی کوئی اسلوب تیار کر سکیں۔ نیز طلباء سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ شعر و ادب کا مطالعہ کریں اور اس منزل پر طلباء کی نظر میں ایسی وسعت پیدا کی جائے کہ وہ مصنف کے نقطہ نظر سے اتفاق یا اختلاف کر سکیں۔

سماج اور زندگی سے متعلق صحت مندرویے پیدا کر سکیں اور زندگی کی اعلیٰ

قدروں کے حامل ہو سکیں۔ طلباء میں تقریری قابلیت اور انشاء کی ایسی صلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ اپنے تخلیقی جوہر بروئے کار لاسکیں۔

چونکہ ہمارے مدارس میں مدرس کو یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ اردو پڑھاتے وقت کن مقاصد کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور نہ طلبہ جانتے ہیں کہ وہ اردو کس لیے پڑھتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اردو کی تعلیم کا آغاز کرنے سے قبل مدعا معلوم و متعین کر لیا جائے تاکہ طلباء فائز المرام ہوں۔ اس مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے معلم زبان کو چاہیے کہ وہ اردو ادب کی تعلیم کا آغاز ”ثانوی منزل“ سے کرے تاکہ طلباء کو زبان دانی کی صحیح تربیت ملے۔

چونکہ ثانوی منزل پر بچوں کا ذہن پر انمیری سطح کی نسبت تیز ہوتا ہے اس لیے اس سطح پر یعنی ثانوی سطح پر ادب کا مطالعہ سکھایا جائے۔ ادب کے مطالعہ کے لیے مختلف مقاصد ہیں جن کو کلچری مقاصد کہتے ہیں۔ یہ تین نکات پر شامل ہیں۔

(۱) ذوق سلیم کی پرورش (۲) تربیت اخلاق (۳) فیصلہ اور تخیل کی مشق

(۱) ذوق سلیم: بچوں میں درسی کتابوں کے علاوہ دوسری اچھی کتابوں کو پڑھ کر ذوق سلیم کی تربیت پیدا کی جائے۔ اس لیے ذوق سلیم کی پرورش زبان کی تحصیل کا اہم مقصد ہے۔ اس سلسلے میں مدارس میں اچھی اور مفید کتابوں کا خاصا ذخیرہ فراہم کرنا ضروری ہے تاکہ بچے ان کو پڑھیں اور رفتہ رفتہ انہیں اچھی کتابوں کے پڑھنے کا شوق ہو جائے اور ذوق سلیم پیدا ہو۔

(۲) تربیت اخلاق: بلند کردار پیدا کرنا مدرس کا اولین فرض ہے۔ تربیت اخلاق ادب کے مطالعے سے ہوتی ہے۔ بعض مفکرین کی رائے ہے کہ کردار اور علم میں گہرا تعلق ہے اس لیے اگر پڑھنے کی کتابوں کا ہوشیاری کے ساتھ انتخاب کیا جائے تو طالب علم کے نیکو کار اور بااخلاق بننے کا امکان زیادہ قوی ہے۔

چنانچہ اکثر درسی کتابیں اخلاقی بنیاد پر لکھی جاتی ہیں یا کم از کم بعض اسباق تربیت کی خاطر شریک کئے جاتے ہیں۔ مثلاً پرانمری اور ثانوی درجوں کی اردو درسی کتابیں اسی طرز پر تیار کی گئی ہیں۔ ہر جماعت میں اردو کی درسی کتابیں اسی طرز پر تیار کی گئی ہیں۔ ہر جماعت میں اردو کی درسی کتاب کا پہلا سبق ”حمد“ دوسرا سبق ”نعت شریف“، اسی طرح تیسرا، چوتھا علی ہذا القیاس تمام اسباق اخلاقی طور تیار کئے گئے ہیں۔ ان میں کسی بڑی شخصیت یا کسی مذہبی تہوار یا قصہ کے بارے میں سبق لکھا ہوتا ہے۔ تاکہ بچوں میں اخلاقی تربیت پیدا ہو جائے۔ آج کل درسی کتابوں میں حب الوطنی کے مضامین یا نظم بچوں میں حب الوطنی کا جذبہ ابھارنے اور بڑھانے کے لیے درج ہوتے ہیں۔ جیسے علامہ اقبال کا سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا، مولانا حالی کی نظم حب وطن یا کسی بہادر تاریخی شخصیت کا ذکر ہوتا ہے جیسے ٹیپو سلطان، رانی جھانسی وغیرہ بہادروں کی داستانیں درج ہوتی ہیں جس سے بچوں میں بہادرانہ جذبہ اور وطن کی محبت کا جذبہ بڑھتا ہے۔ اس طرح ادب کو ادب کی خاطر نہیں پڑھایا جاتا بلکہ کسی اخلاقی یا علمی یا حب الوطنی مقصد کے مد نظر اس کی تحصیل کی جاتی ہے اور اس تحصیل سے جذبات پر اثر پڑتا ہے اور جذبات ان خصائل کی رہنمائی کرتے ہیں۔

(۳) فیصلہ اور تخیل کی مشق: مدرس کو چاہیے کہ وہ بچوں میں قوت فیصلہ کی صفت پیدا کرنے کی غرض سے ان کی تربیت کرے مثلاً بحث و مباحثہ وغیرہ طلبہ کو صحیح فیصلہ تک پہنچانے کے لیے دلائل طلبہ کے سامنے پیش کرے۔

تخیل

ہے۔ مدرس کا کام ہے کہ طلبہ کا تخیل زندگی کی اعلیٰ اقدار کی طرف موڑے تاکہ طلباء بااخلاق اور باکردار بنیں اور طلباء کا دماغ ہمیشہ اعلیٰ خیالات، اچھے جذبات اور نیک خواہشات کا خزانہ بن جائے۔ اس طرح ادب کی صحیح تعلیم طلباء میں جاگزیں ہو جاتی ہے۔ ادب محض فن نہیں ہے وہ زندگی بھی ہے اور ایک پاکیزہ ادبی ذوق بڑی نعمت ہے۔ یہ ہماری تمدنی و تہذیبی میراث کا ایک بہت بڑا جز ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطحوں پر اردو ادب پڑھنے سے اچھی مشرقی اور قومی جذبات کا احترام پیدا ہو جاتا ہے اور اس بنیاد پر تمام انسانیت کی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ نقطہ نظر میں بقول علامہ اقبال ”انداز آفاقی“ آ جاتا ہے اور طلباء ادب کو بیکاری کا مشغلہ یا ایک ضروری گناہ (necessary evil) سمجھنے کی بجائے اچھی زندگی کا رفیق سمجھیں گے۔ یہ اغراض و مقاصد مد نظر رکھتے ہوئے طلباء مہذب، زندہ، بیدار اور پُر خلوص انسان بننے کے قابل بن جائیں گے۔

طلباء کو مشقوں، سوالوں اور ادبی منصوبوں کے ذریعے سے کام لے کر ان کی تحریر و تقریر دونوں میں صحیح، سادہ، عام فہم اور زندہ اردو زبان کے نمونے مل جاتے ہیں۔ اور طلباء میں صحیح شعور اور صحیح رویے فروغ پاتے ہیں۔ ان تمام مقاصد کا حصول اسی وقت ممکن ہے جب اساتذہ اردو زبان و ادب کا شعور اور تغیر پذیر زندگی کی گہری بصیرت رکھتے ہوں۔ محض درسی کتاب کے مطالعہ کے حدود میں رہ کر خاطر خواہ کامیابی نہ مل سکے گی۔

آخر میں علامہ اقبالؒ کے اس شعر سے زبان پڑھانے کے مقاصد اچھی طرح واضح ہو جاتے ہیں۔

چمن میں تربیت غنچہ ہو نہیں سکتی

نہیں جو قطرہ شبنم اگر شریک نہ

ایک اچھے اُردو معلم کے اوصاف

ماہرین تعلیم نے تعلیم کے پانچ ستون تسلیم کئے ہیں۔
(۱) معلم (۲) متعلم (۳) مربی یعنی والدین و سرپرست (۴) منتظمین

(۵) ماحول

معلم یا مَدِرس یا اُستاد

معلم تعلیم کا ایک اہم ستون سمجھا جاتا ہے اور معمار قوم بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ملک اور قوم کی بنیاد مضبوط و مستحکم کرتا ہے۔ چونکہ آج کے طلباء کل کے شہری ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی سے جہالت کی تاریکی دور کرتا ہے۔ اور ان کا مستقبل روشن اور تابناک بناتا ہے۔ اُن کی شخصیت کی صحیح نشوونما اور رہنمائی کرتا ہے۔ وہ طلباء کی نفسیات سے واقف ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بچہ میں کیا تغیر و تبدل ہونے والا ہے۔ اس کے مطابق بچہ کے عادات و اطوار اور شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

معلم کی حیثیت ایک گائیڈ کی ہوتی ہے۔ وہ طلباء کی راہنمائی کرتا ہے اور انہیں سیکھنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ ان میں پڑھنے اور لکھنے کی دلچسپی پیدا کرتا ہے۔ گویا ایک اچھا معلم ایک اچھا رہبر ایک اچھا سرپرست اور ایک اچھا نگران بھی ہوتا ہے۔ وہ والدین سے بھی زیادہ طلباء کا سچا ہمدرد اور مخلص ہوتا ہے۔

مدرس معلومات، فنِ تعلیم اور اخلاق کے اعتبار سے ایک معمولی تعلیم یافتہ آدمی کے بہ نسبت اونچے درجے کا ہو۔ چونکہ بچے قومی عمارت کے بنیادی مسالے ہیں اس لیے ان کے معمار میں مندرجہ ذیل اوصاف کا ہونا از بس ضروری ہے۔

چونکہ لفظ مدرس چار حروف کا مرکب لفظ ہے: م، د، ر، س
م: م کا مطلب ہے ماہر، محبتی، محنتی، مُبلغ۔

ایسے اوصاف خاص کر ایک اُردو مدرس کے لیے ہونے ضروری ہیں۔ مدرس کو بچوں سے قریب ویسی محبت ہو جیسی ماں کو اپنے بچوں سے ہوتی ہے۔ جب تک یہ چیز نہ ہو بچوں میں خوف ہوگا اور وہ آزادی سے نہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں گے۔ اور نہ کھلے طور پر فطری حرکات کا ان سے ظہور ہوگا اور یہ تعلیم میں خاص اہمیت ہے۔ کہ مدرس محبتی، محنتی اور اپنے مضمون کا ماہر ہو اور درس و تدریس کی مہارت رکھتا ہو۔ خاص کر زبان دان اور بچوں کو اچھی طرح زبان سکھانے، سمجھانے اور پڑھانے کی مہارت رکھتا ہو۔

حرف ”ذ“ سے مراد ہے دانا ہو، دانشمندی سے کام لیتا ہو، کیونکہ شعور کو باشعور بنانے کا کام مدرس کے ذمہ ہے۔ اس لیے دانشمندی مدرس کا زیور اور سجاوٹ ہے۔
حرف ”ر“ سے مراد ہے راہ نما، رہبر۔

”چونکہ والدین بچے کو عرش سے فرش کو لاتے ہیں جب کہ اُستاد اس کو فرش سے عرش کو لیتا ہے“۔ راہ نما سے مراد ہے راستہ دکھانے والا۔ اور رہبر سے مراد ہے ہادی یعنی ہدایت کرنے والا اور صحیح اور ٹھیک راستہ دکھانے والا۔ چونکہ قوم کی ہدایت ایک اُستاد کے ذمہ ہے بشرطیکہ یہ صفت اُس میں موجود ہو۔ ”آج کا بچہ کل کا شہری“۔ صحیح شہری بنانا ایک اچھے اُستاد کے ذمہ ہے۔

گناہوں کی جڑ ہے خواہ گناہِ صغیرہ ہو کبیرہ۔ بچے اُستاد کی تمام حرکات و سکنات دیکھتے ہیں۔ مشاہدہ کرتے ہیں اور اُستاد کے رفتار و گفتار کی نقل کرتے ہیں اس لیے اُستاد کا کلام ہمیشہ سچ ہو۔ اُستاد کی ہر بات بچوں کے ذہن میں آتی ہے اور ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ اس لیے ایک اچھے استاد کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ راست گوئی سے کام لے تاکہ بچے بھی راست گو بنیں۔

چونکہ طلباء کی تعلیم و تربیت، اُن کا مستقبل اور آئندہ نسلوں کی سیرت کا بننا اور بگڑنا مدرس کی کوششوں پر منحصر ہے۔ اس لیے مدرس اپنی شخصیت اور ذاتی اوصاف کا رول اچھی طرح نبھائے۔

مدرس کو چاہیے کہ وہ گفتار، رفتار، کردار اور دستار یعنی ان چار الفاظ جو حرف ”ز“ پر ختم ہوتے ہیں کا خیال رکھے کہ گفتار یعنی کلام کیسا ہے کس کے ساتھ ہے؟ کیا کلام اخلاق سے پُر ہے یا نہیں کیونکہ ایک انگریزی کہاوت ہے:

"A kind word costs nothing but gains something".

اس لیے مدرس با اخلاق ہو، حلاوت رکھتا ہو، فضول اور خرافات گوئی سے پاک و صاف ہو تاکہ طلباء شعوری اور غیر شعوری طور پر مدرس کے گفتار سے متاثر ہو جائیں۔

رفتار: مدرس کو چاہیے کہ وہ اپنی رفتار میانہ بنائے۔ نہ زیادہ تیز اور نہ زیادہ سست۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: ”ولا تمشی فی الارض مرحاً“ (سورہ لقمن: ۱۸) یعنی ”زمین پر اکڑا کر کمر مت چلو“۔

مُعلم کی رفتار سے پتہ چلنا چاہیے کہ مُعلم چلتا ہے، رفتار مناسب ہوتا کہ بچے مناسب رفتار چلنا سیکھیں۔

کردار: ایک انگریزی کہاوت ہے:

"Wealth is lost nothing is lost, health is lost something is lost, character is lost everything is lost".

اس لفظ میں زندگی کا ہر عمل پہلو موجود ہے کیونکہ بقول علامہ اقبالؒ
 عمل سے زندگی بستی ہے جنت بھی جہنم بھی
 یہ خاک اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
 نور اور نار صرف عمل سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔ اگر کردار یعنی عمل صحیح ہو تو نور
 ہے اگر ناصحیح ہو تو جہنم ہے۔ ایسا صرف عمل اور کردار پر منحصر ہے۔
 مدرس بھی نیک عمل ہوتا کہ بچوں پر اس کے نیک کردار کا اثر پڑے۔
 اس طرح یہ ”ز“ والے الفاظ ایک اچھے مدرس کے اوصاف کے حامل ہیں۔
 معلم خواہ کسی بھی مضمون کا ہو وہ اچھے اوصاف کا پیکر ہو۔

اردو زبان کا استاد بھی ایک مضمون کا استاد ہے۔ اردو زبان کا درجہ بنیادی حیثیت
 کا حامل ہے اور اس زبان کے استاد کی شخصیت اور قابلیت کا مجموعی اظہار ہوتا ہے۔ اس
 لیے ایک اچھے اردو مدرس میں حسب ذیل اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے۔

اردو زبان سے واقف ہو

اردو مدرس اردو زبان سے واقفیت رکھتا ہو۔ اردو قواعد، صرف و نحو، اردو بول
 چال پر پورا عبور ہو۔ اردو رسم الخط سے بھی واقف ہو۔ اردو پڑھنے اور لکھنے کی
 مہارت رکھتا ہو۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ سے واقفیت رکھتا ہو۔ اردو تقریر اور
 تحریر سے بخوبی واقف ہو گو کہ اردو مدرس اردو زبان کا ہر صورت میں مکمل جانکاری
 رکھتا ہو۔ اس میں شاعرانہ صلاحیت بھی موجود ہونی چاہیے۔

اُردو ادب سے واقف ہو

اُردو مدرس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اُردو ادب سے اچھی طرح واقف ہو۔ وہ طلباء میں اُردو ادب کا صحیح ذوق و شوق پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ وہ اصناف ادب اور اصناف سخن کی صحیح جانکاری رکھتا ہو۔ مثلاً ناول، افسانہ، داستان، انشاء، مضمون نگاری، نثر اور شاعری کے اصناف مثلاً غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی اور دیگر اصناف جیسے شہر آشوب، واسوخت، قطعہ، ترجیع بند، ترکیب بند، مسدس، مثنیٰ، مخمس اور مستزاد وغیرہ کے بارے میں پوری مہارت رکھتا ہو۔ غرض ہر صورت میں اُردو مدرس اُردو لسانیات و ادبیات سے شغف رکھتا ہو۔ نیز اُردو درس و تدریس کا ماہر ہو۔ پڑھانے اور لکھانے کے گرجا جانتا ہو۔ شاعروں، ادیبوں کے بارے میں پوری جانکاری رکھتا ہو اور ان کی فنی صلاحیتوں سے پورا باخبر ہو۔ ان اوصاف کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک اُردو معلم صحیح طور اُردو پڑھانے اور سکھانے کے لیے موزون اور مناسب ہے۔

خوش خوانی کے اوصاف کا حامل ہو

پڑھانے کے جو اوصاف زبان دانوں نے مقرر کئے ہیں اُن کے بارے میں صحیح صلاحیت رکھتا ہو جیسے اخراج، اعراب، تغیر لحن، فقرہ بندی، معنی آفرینی، روانی، سلاست وغیرہ سے پورا پورا ماہر ہو۔ تلفظ صحیح ہو، لفظوں کا اُتار چڑھاؤ سے واقف ہو۔ نظم ترنم سے پڑھانا جانتا ہو گو کہ اس کا لحن اور آواز میٹھی اور شیریں ہونی چاہیے تاکہ بچوں میں جمالیاتی ذوق بڑھے نیز اس کی صحیح تربیت ہو جائے اور خوش خوانی کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہو۔

خوش نویسی کا ماہر ہو

اُردو مدرس خوش نویس ہونا چاہیے اور خوش خطی کے اوصاف کا حامل ہو۔ مدرس خود خوش نویس ہو تو بچے بھی خوش نویس ہوں گے۔ کیونکہ اچھا خط ہر کسی کو اچھا لگتا ہے۔ اس طرح یہ صنعت خود بخود بچوں میں اثر کرے گی اور بچے بھی اس صفت سے مالا مال ہو جائیں۔

طلباء کی تعلیم و تربیت میں معلم کی اپنی شخصیت اور اس کے ذاتی اوصاف اہم کردار کرتے ہیں۔ طلباء اساتذہ سے شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ ان کی باتوں کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں یہاں تک کہ والدین کی باتوں کو غلط سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے 'سر' نے یا ہماری میڈم نے ہمیں بتلایا ہے۔ طلباء اساتذہ کی سمجھائی ہوئی باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیتے ہیں۔ یہ نقش انٹ ہو تا ہے اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم ایسے معلم کی تقلید کریں جو اچھی خوبیوں کا مالک ہو۔ خواہ وہ خوبیاں بلحاظ قابلیت ہوں یا بلحاظ شخصیت۔ اس لیے مدرس بلحاظ شخصیت بھی خوبیوں سے مالا مال ہو اور بلحاظ قابلیت بھی۔

(۱) شخصیت میں اچھی صحت رکھتا ہو

ایک اچھے معلم کی شخصیت کا انحصار اس کی صحت پر ہوتا ہے۔ اگر وہ صحت مند ہے تو وہ ذہنی لحاظ سے بھی صحت مند ہوگا۔ کیونکہ صحت مند جسم انسانی شخصیت کی تنظیم میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

"Sound mind in a sound body"

اس لیے صحت مند استاد ہی قوم کا صحیح خیر خواہ بن سکتا ہے۔

(۲) لباس

حدیث شریف ہے: ”الْبَاسُ بِالْبَاسِ“

یعنی انسان کی زینت اور خوبصورتی اس کے لباس میں مضمر ہے۔ اچھا لباس پہننے والا اُستاد بچوں کے لیے ایک نمونہ ہوتا ہے اور لباس سے ہی اس کی شخصیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ایک اور حدیث میں آیا کہ ”صفائی آدھا ایمان ہے“۔ اللہ تعالیٰ بھی سورہ مدثر میں پہلی دو تین آیات میں فرماتا ہے کہ اپنے لباس اور جسم کو کثافت یعنی گندگی سے دور رکھو۔ اس لیے صاف ستھرے کپڑے ایک اُستاد کی شخصیت نمایاں کرتے ہیں اور شخصیت صاف طور واضح ہو جاتی ہے۔

(۳) خوش اخلاقی

خوش اخلاقی کا ذکر گفتار کی تشریح میں بیان ہوا وہ یہ کہ مدرس کا کلام شیریں اور

لطیف ہو۔

دیانت دار ہو: معلم کو دیانت دار ہونا چاہیے۔ اپنا کام بخوبی انجام دیتا ہو۔

خاص کر طلباء کو دل لگا کر پڑھائے۔

اُردو مدرس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہنس مکھ ہو اور ساتھ ہی

طلبہ میں جوش عمل پیدا کرے۔ نیز اس کے لیے بعض معلومات بھی ضروری ہیں۔

اردو لسانیات اور اردو ادب کے علاوہ چند دوسری زبانوں سے واقف ہونا اس کے

لیے ضروری ہے۔ بعض اساتذہ کا قول ہے ”کئی زبانیں جاننے والا ایک زبان

جاننے والے سے بہتر ہے“ کم از کم ایک قدیم اور ایک جدید زبان دان ہو۔ مثلاً

قدیم زبانوں میں عربی، فارسی یا سنسکرت مفید ہے۔ جدید میں انگریزی کی واقفیت

مفید ہے۔ دوسری زبانیں جاننے سے اکثر محاوروں، تلمیحوں اور تشبیہوں کے سمجھنے اور سمجھانے میں مدد ملتی ہے۔

اُردو مدرس بچوں کی نفسیات سے واقف ہو

اُردو مدرس کم از کم اتنا جانتا ہو کہ بچوں کے طبعی خواص کیا ہوتے ہیں۔ چُستی، کھیل، نقل بازی ہر چیز کی ماہیت و اسباب کے متعلق راز جوئی وغیرہ بڑے بڑے خواص ہیں جن سے تعلیم میں بڑے بڑے کام لئے جاسکتے ہیں۔ جیسے قدرتی اشیاء میں غور و فکر کرنے کا اور نئے نئے عمل و تجربے کا شائق ہو۔

اُردو مدرس کے لیے ضروری ہے کہ وہ فنی کتابوں، رسالوں اور طریقہ تعلیم سے متعلق دوسروں کے تجربات پر لکھے ہوئے مضامین پڑھنے کا شوق رکھتا ہو۔ ان سے مفید طلب باتیں اخذ کر کے اپنی یادداشت میں لکھتا رہے اور وقت ضرورت ان سے مدد لے۔ اُردو مدرس کی زبان صحیح، نرم اور محبت آمیز ہو۔ تحکمانہ نہ ہو۔ درس و تدریس کا کام نوکری سمجھ کر نہ کرتا ہو بلکہ اسے اپنی زندگی کا ایک فریضہ تصور کرتا ہو اور بچوں کے ساتھ کام کرنے میں اسے فرحت و مسرت ہو۔

ایک شاعر کلیم ضیاء نے اپنے اشعار میں معلم کی توصیف کی صحیح عکاسی کی ہے۔
 میں معلم ہوں تدریس ہے میرا پیشہ
 نامہذب کو میں تہذیب کی نمودیتا ہوں
 میری ہستی ہے ضیاء خلق و مسرت کا سپراغ
 میں زمانے کو نئے عزم کی لودیتا ہوں

اُردو پڑھانے کی مشکلات

اردو زبان قومی اور بہت شیریں زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کروڑوں لوگ شعوری اور غیر شعوری طور پر اس کے گرویدہ ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ زبان اظہار و ترسیل کا ذریعہ ہوتی ہے۔ جسے کوئی بھی قوم اپنے زیر استعمال لاسکتی ہے۔ مگر یہ اردو زبان کی بد قسمتی ہے کہ اسے مسلمانوں کے ساتھ جوڑا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامیات کا ایک عظیم ذخیرہ اس میں منتقل ہو چکا ہے۔ عربی زبان کے بعد اردو زبان دوسرے نمبر پر ہے کہ اسلام کے تعارف کے لیے اس زبان میں کتابیں لکھی گئیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اسلامی وراثت کو روشناس کرانے میں اب اردو زبان فارسی زبان سے آگے نکل چکی ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ غیر ارادی طور پر مسلمان اسے قریب ہوئے تو فرقہ پرست طاقتوں نے اسے مسلمان اور اسلام سے جوڑ دیا اور اسی بنیاد پر اب تک تعصب کی مار برداشت کرتی چلی آ رہی ہے۔

اُردو کو جو حق ملنا چاہیے تھا نہیں ملا۔ اس میں حکومت کی جانب داری تو ہے ہی مسلمانوں کی بھی بہت ساری کوتاہیاں رہی ہیں۔ مسلمانوں کی نئی نسل اب اردو زبان سے نابلد ہوتی جا رہی ہے۔ ان میں ان کی اولادیں بھی شامل ہیں۔ جو اپنی تحریروں اور تقریروں میں اُردو کا رونا روتے ہیں۔ اور اردو کی ترقی کی بات کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے بچے انگلش میڈیم اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور انہیں اسی میں اپنا مستقبل تابناک نظر آتا ہے۔ یہ لوگ بلکہ اس ملک کی

بڑی اکثریت یہی کہتے سنائی دیتی ہے کہ اردو زبان میں کیرئیر نہیں بنایا جاسکتا۔ اور اگر بن بھی گیا تو پُرکشش تنخواہ نہیں مل پاتی۔ اکثر لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اردو زبان اس لیے ترقی نہیں کر رہی ہے یا اس میں کیرئیر اس لیے نہیں بن پاتا کہ اسے روزی روٹی سے نہیں جوڑا گیا ہے۔ جس دن یہ زبان روزی روٹی سے حبسٹ جائے گی تو اس کی ترقی شروع ہو جائے گی۔ اس ضمن میں ہم حکومتی اور سرکاری اہلکاروں کو کوستے رہتے ہیں اس سلسلے میں غرض یہ ہے کہ روزی روٹی کا مسئلہ کسی زبان سے نہیں تعلیم سے جڑا ہوتا ہے۔ تعلیم جتنی بہتر اور معیاری ہوگی ترقی اتنی ہی رفتار سے قدم بوسی کے لیے دوڑتی ہوئی پاس آئے گی۔

یہ اردو والوں کی کم نصیبی ہے کہ وہ اردو زبان کے غم میں مرے جا رہے ہیں اور اردو زبان کے دروازے سے ترقی کی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ وہ زبانی دعوے تو بہت کرتے ہیں عملاً کچھ نہیں کرتے۔ اردو والے اپنی ناکامیوں کا شمرہ حکومت اور فرقہ پرست طاقتوں کے سر منڈھ کر دراصل اپنی ناکامی اور کم ہمتی کو چھپانا چاہتے ہیں۔ وہ محنت کرنا جانتے ہی نہیں۔

اردو کی تعلیم پر توجہ نہیں دی جاتی ہے ہمارے تعلیمی اداروں کی صورت حال نہایت افسوسناک ہے کہ یہاں اردو کی تعلیم نہایت غیر معیاری ہو رہی ہے۔ بڑے بڑے اردو میڈیم اسکول تو قائم ہیں لیکن اساتذہ غیر معیاری ہیں۔ جب اردو تعلیم بہتر نہیں ہوگی تو ترقی بھی نہیں ہوگی۔ اور یہ مشکل حل نہیں ہوگی۔ اس لیے زبان کو روزی روٹی سے جوڑنے کے بجائے تعلیم سے جوڑنا ضروری ہے جس سے ترقی کے دروازے خود بخود کھلیں گے۔

اس ملک کے سیاست دانوں، مفکروں، ادیبوں، شاعروں غرض ہر خاص و عام ذی شعور کو یہ احساس ہے کہ اردو زبان ایک زندہ جاوید زبان ہے اور اس زبان

کے ساتھ جو نا انصافیاں ہوئی ہیں اور ہوتی جا رہی ہیں ان کا تدارک کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ تدارک کس طرح ہو اور وہ کون کون سے مشکلات ہیں جس وجہ سے اس زبان کی ترقی ناممکن بن گئی ہے۔

چونکہ اوپر بھی بیان کیا گیا کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں اُردو دان معلمان کی کمی کی وجہ سے یہ زبان قوم کے اُن نونہالوں تک صحیح طور پر ترسیل نہیں ہوتی ہے جن نونہالوں کی قسمت قوم کے ساتھ وابستہ ہے اور نہ بنیادی سطح پر بچوں کو اُردو کی صحیح تعلیم دی جاتی ہے۔ کیونکہ پہلے ہی ان کا اندراج انگلش میڈیم اسکولوں میں کیا جاتا ہے۔ جس وجہ سے بچے بنیادی طور پر اس زبان سے نا بلدرہ جاتے ہیں۔

بقول سعدیؒ

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا سے رود دیوارِ کج

اردو پڑھانے والے اُستاد کو اگر اس حقیقت سے جوڑا جائے تو تو غلط نہ ہوگا کہ ”اُردو معلم کو گلستانِ اردو ادب کے ایک پریشان حالی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اب بھی رقیبانِ اردو کے سامنے اپنی وضع قطع بنائے ہوئے ہیں۔“

اُردو معلم اردو زبان و ادب کے گلستان کا مالی ہے اور اس گلستانِ ادب کی سجاوٹ اور نکھار اردو معلم کے ہاتھوں میں ہے۔ مگر جہاں تک ہمارے تعلیمی اداروں میں اردو معلم کا رتبہ ہے وہ بالکل کم ہے۔ اس کے برعکس باقی مضامین کے اساتذہ کی اچھی عزت ہوتی ہے۔ خاص کر ایک انگریزی پڑھانے والے اُستاد یا دیگر مضامین پڑھانے والے اساتذہ کی عزت اردو معلم کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ پھر بھی یہ اردو معلم اپنا طور طریقہ نہیں چھوڑتا ہے اور اس گلستانِ اردو ادب کی رکھوالی

میں کو مشاغل رہتے ہیں اور اپنی حالتِ برتری کے کہہ کر زبان کی حالتِ اداس

فروغ دینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتا ہے۔

اردو، پڑھنا، سیکھنا دراصل ایک مشکل کام ہے۔ اس کے دو وجوہ ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کا رسم الخط فارسی رسم الخط سے ملتا جلتا ہے جو کہ اعراب کے بغیر ہے۔ اس لیے بچوں کو اردو پڑھنے اور لکھنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ رسم الخط کی خرابی یہ ہے کہ مفرد اور مرکب۔ ہر دو قسم کی علامتیں من مانے طریقے سے استعمال کی جاتی ہیں۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ طالب علم چھوٹے چھوٹے بچے ہوتے ہیں۔ جن کے قوائے ذہنیہ طاقتور نہیں ہوتے ہیں۔ اس لیے جو دشواریاں پڑھنے یا سیکھنے اور لکھنے میں سب کو پیش آتی ہیں وہ بچوں کے لیے مشکل ہو جاتی ہے۔ چھوٹے بچوں کی دشواریاں اس وجہ سے اور بھی بڑھ جاتی ہیں کہ اس زبان میں تلفظ کی بے قاعدگیاں بہت سی پائی جاتی ہیں۔ ”مورل“ کا خیال ہے کہ ”بچوں کو حروف کی آواز کے بارے میں غلط فہمی ہو جاتی ہے جو رفتہ رفتہ مشق اور تکرار سے صاف ہو جاتی ہے۔“ بچے الفاظ کو بہت سی کوششوں کے بعد پہچاننے لگتے ہیں لیکن ”فج“ کا خیال ہے کہ یہ بے قاعدگیاں بچوں کی نظر میں نہیں ہوتیں بلکہ ماہر لسانیات کے خیال میں ہوتی ہیں۔ ”بچے تو جیسا بڑوں کو تلفظ کرتے سنتے ہیں ویسا ہی تلفظ کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح اردو پڑھنے اور لکھنے میں بچوں کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسا مد نظر رکھتے ہوئے ایک اردو معلم اردو زبان کا ماہر ہوتا کہ ان مشکلات کا یہ زبان پڑھاتے ہوئے ازالہ ہو سکے۔

”ہندوستان میں اب اردو نہیں، ہندی مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔“

ہمارے بعض دانشوروں کی اصطلاح میں اردو مشترکہ تہذیب کی علامت

ہے۔ مشترکہ تہذیب سے ان کی مراد ہندو مسلم تہذیب سے ہے۔ انیسویں صدی اور

بیسویں صدی کے نصف اول تک اردو سرکاری زبان تھی۔ امور انتظامیہ اور ذرائع ابلاغ پر اردو اور فارسی کا گہرا اثر تھا۔ اس لیے ہر شخص کے لیے بلا تفریق مذہب روزی روٹی کے حصول کے لیے اس زبان کا جاننا ضروری تھا۔ ہندوستانی معاشرے پر اردو کا اتنا زبردست اثر تھا کہ مسلمان اور ہندو دونوں کے ذاتی معاملات، رسم و رواج، شادی بیاہ، لین دین، حساب کتاب، اجتماعی تقریبات، جلسے جلوس، گفت و شنید اور دوسرے سماجی مسائل عموماً اسی زبان کے وسیلے سے ہی نمٹائے جاتے تھے۔ ہندو شادیوں میں بھی دعوت نامے اردو میں چھپتے تھے۔ ان کے جلسے جلوسوں کے ’بیزر‘ اور اشتہارات وغیرہ اردو ہی میں لکھے جاتے تھے۔ کاروباری بھی کھاتے اکثر اردو میں درج کئے جاتے تھے۔ ان کی دکانوں کے بورڈ اردو میں ہوتے تھے۔ ان کے بیشتر گھروں میں اردو اخبارات پڑھے جاتے تھے۔ کورٹ پکچری کی زبان اردو تھی۔ اس لیے وکلاء اردو زبان میں بحث کرتے تھے اور فاضل جج صاحبان، فیصلے اردو میں لکھا کرتے تھے۔ مسلمانوں کے ہر شعبہ زندگی تو خیر اردو ہی اردو تھی۔ اس کا ذکر ہی کیا لیکن ہندوؤں کا بھی ہر شعبہ اردو سے معطر اور مرصع تھا۔ اس لیے کہا جاتا تھا کہ اردو ہندو مسلم تہذیب کی علامت ہے۔

ہندوؤں نے اردو کو اس لیے ترجیح دیا کہ اب اس سے مالی منفعت حاصل نہیں ہو سکتی تھی جب تک ہو سکتی تھی خوب لکھا پڑھا اور سیکھا اور فائدہ اٹھایا۔ لیکن جب یہ بات واضح ہو گئی کہ بدلے ہوئے موسم میں اسے سیکھنا تنضیع اوقات ہے تو انہوں نے اسے پڑھنا بند کر دیا۔ اور اپنی زندگی کے ہر شعبہ سے اسے نکال باہر کیا۔ اب ہندی خصوصاً شمالی ہند میں پورے معاشرے پر چھائی ہوئی ہے اور منظر انیسویں اور اوائل بیسویں صدی سے الٹا ہو گیا ہے۔ جو مقام ان دنوں اردو کا تھا وہ

اب ہندی نے حاصل کر لیا ہے اور ہندوؤں کو تو خیر جھوٹے مسلمانوں نے بھی اپنی

زندگی کے ہر شعبے میں اسے بڑی گہرائی سے داخل کر لیا ہے اور اردو کا باہر نکال پھینکا ہے۔ مسلمانوں کے ذاتی معاملات، رسم و رواج، شادی بیاہ، لین دین، تقریبات، گفت و شنید اور جلسے جلوسوں میں اردو کہیں دکھائی نہیں دیتی، ہر طرف ہندی ہی ہندی نظر آتی ہے۔ شادی بیاہ کے دعوت نامے ہندی یا انگریزی یا کشمیری میں چھپتے ہیں۔ تقریبات کے بورڈ، جلسے جلوسوں، مشاعروں اور قوالیوں کے 'بینر'، قبرستانوں کے کتبے، گھروں اور ناموں کی تختیاں، دوکانوں کے سائن بورڈ، کاروباری حساب کتاب، یہاں تک کہ مدرسوں اور مسجدوں کے لیے چندے والی رسید بک اور مسجدوں میں اقوال زریں وغیرہ تمام اُردو زبان کے بجائے ہندی اور حنا ص کر انگریزی زبان میں لکھے جاتے ہیں۔ اردو زبان کا نام و نشان ہی نہیں۔ اکثر مسلمان گھروں میں اخبارات ہندی زبان میں پڑھے جاتے ہیں۔ اردو اخبار کا نام لوتو ہنتے ہیں۔

اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اس خیال کو اپنے دماغوں سے نکال دیں کہ اُردو مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔ شمالی ہند میں اب اردو نہیں، ہندی مشترکہ تہذیب کی علامت ہے۔ اس لیے آنے والی نسل کے لیے ایک مشکل بن گئی ہے کہ وہ اردو زبان پڑھیں، سیکھیں اور لکھیں۔ جب کہ سماج کا اکثر حصہ ہندی اور انگریزی زبانوں کا گرویدہ ہو چکا ہے۔ اور اردو کے بجائے ان زبانوں کے فروغ میں کوشاں ہے۔

اُردو کتابوں کی نایابی

سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کتب خانوں میں اردو کتابوں کی نایابی

کی وجہ سے اردو زبان پڑھنے پر مانع اور یکے کے لیے بہت مشکلات پیش

آتی ہیں۔ اگر کہیں کوئی کتاب دستیاب بھی ہو جاتی ہے تو قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے خریدنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اکثر طلباء قوت خرید نہ ہونے کی وجہ سے کتاب خریدنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔

اُردو دانوں کی ذمہ داری

حکومت کے ساتھ ساتھ اُردو دانوں پر بھی بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ اگر وہ اردو کی بقاء چاہتے ہیں تو اُن کو چاہیے کہ وہ خلوص دل سے اردو کو زندہ رکھنے کے لیے مقدور بھر کوشش کریں تاکہ اس زبان کو فروغ ملے اور مشکلات کا ازالہ ہو جائے۔

بقول جناب خواجہ احمد فاروقی ”مجھے اردو کی ترقی کے لیے نہ حکومت سے اندیشہ ہے اور نہ ہندو بالوں کا خوف ہے بلکہ سچ پوچھئے کہ اردو دانوں کی بے بسی اس کے حق میں سب سے بڑا خطرہ ہے۔“

اس میں شک نہیں کہ اُردو سے خود اُردو دان طبقہ کی دلچسپی ختم ہوتی جا رہی ہے تو دوسرے مذاہب والوں کا کیا کہنا۔ اگر اُردو والے خلوص دل سے اردو کی بقاء اور ترقی چاہتے ہیں تو ادب کو دولت سے اونچا مقام دینا ہوگا۔ اگر اس نازک وقت میں ہم ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے رہیں، تعصب، تنگ نظری اور باہمی منافرت کے شعلوں کو بھڑکاتے رہیں تو پھر اردو کا خدا حافظ۔

بقول پنڈت آمند زائن ملّا ”آج اُردو کے ساتھ ایسی زبردست نا انصافی روا رکھی گئی تو کیا اندیشہ نہیں کہ کل کوئی گروہ کسی اور زبان کے ساتھ وہی سلوک کرے جو اردو کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ جمہوری نظام میں روایات قائم کر کے جمہوریت کی بیخ کرنا ہے۔ زندگی کا ایک اٹل قانون ہے کہ جب ہم کسی دوسرے کا حق چھینتے ہیں

اُس وقت ہم خود اُس روز کو دعوت دیتے ہیں جب ہمارا حق بھی لازمی طور پر ہم سے کوئی اور چھین لے گا۔ بقول پنڈت آنند موہن گلزار ۔

علاج ہی نہیں منظور اہل اردو کو
گواہ پُست، تمنائے مدعی کم ہے

اردو زبان کی طرف عدم توجہی

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ پڑھ لکھے والدین جن کے بچے دیگر مضامین میں تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ اردو زبان کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے ہیں وہ اکثر اردو بیزاری دکھاتے ہیں۔ اور اپنے بچوں کو اردو پڑھنے نہیں دیتے ہیں۔ بُرا اثر اردو اور اُن طلباء پر پڑتا ہے جو اس زبان سے محروم رہتے ہیں۔ اس میں اردو کا کوئی قصور نہیں ہے، اگر قصور ہے تو وہ ان والدین اور اساتذہ کا ہے جو بچوں کو اس زبان سے محروم رکھتے ہیں۔ اگرچہ طلباء کو باقی مضامین میں اچھی اچھی ڈگریاں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خوب موقع ملتا ہے۔ وہ قلم کار، اور دیگر اچھے اچھے منصوبوں پر فائز ہوتے ہیں مگر اس شیریں زبان سے ناواقف رہ جاتے ہیں۔

اردو تعلیم و تدریس کے سلسلے میں اساتذہ کی بہت سی دشواریاں سکولی یا کالج یا یونیورسٹی سطح پر ہیں۔ یہ دشواریاں اکثر و بیشتر سرکار اور معتبصانہ ماحول کی پیدا کردہ ہیں۔ مگر جہاں یقین محکم و عمل پیہم ہو وہاں دشواریاں بھی آسان ہو جاتی ہیں۔

کالجوں میں مختلف مضامین (Subjects) کے ساتھ اردو کی گروپنگ (Grouping) کچھ اس طرح رکھی جاتی ہے کہ طلبہ حسب منشاء دوسرے مضامین کے ساتھ بحیثیت ایک مضمون اختیار کرنے سے معذور رہ جاتے ہیں۔

اردو تعلیم و تدریس کا مسئلہ دراصل اردو اساتذہ، طلبہ اور نصابی

کتابوں کے مسائل کا مرکب ہے۔ ان کے علاوہ سماجی بحران، تعصب، تنگ نظری، تعلیمی اداروں میں نظم و ضبط کی بد حالی نے اردو کے تعلیمی مسائل کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے۔

تعلیم محض معلومات بہم پہنچانے یا فراہمی دولت کا نام نہیں بلکہ کردار سازی ہے۔ ادب اور فنون لطیفہ کے ذریعہ ہی ہماری آئندہ نسل کی جذباتی زندگی کی تنظیم اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما ممکن ہے۔

ان تمام مسائل کے باوجود اب بھی اردو زبان اور اس کی تدریس کا مستقبل ہمارے ملک میں روز بروز فروغ پا رہا ہے اور ساتھ ساتھ روشن ہوتا جا رہا ہے۔ مثلاً مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ایک سنٹرل اردو یونیورسٹی ہے جس کا دائرہ کار پورا ہندوستان ہے۔ یہ اپنے ریجنل اور ڈسٹرکٹ اسٹیڈی سنٹر حسب ضرورت ملک کے کسی بھی خطے میں کھول سکتی ہے۔ اور ضرورت پڑنے پر ہندوستان سے باہر کسی بھی ملک میں جہاں طلبہ کو اردو ذریعہ تعلیم سے دلچسپی ہوگی وہاں بھی اپنے سینٹرس قائم کر سکتی ہے۔ اردو زبان یا اردو میڈیم میں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ سطح کی تعلیم دینا اور ساتھ ساتھ ہر ممکنہ طور پر یہ کوشش کرنا کہ تمام عصری علوم کو اردو میں منتقل کر کے سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ، میڈیکل، کمپیوٹر اور منیجمنٹ وغیرہ کے کورسز پڑھائے جاتے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

اس کونسل کا بنیادی مقصد فروغ اردو زبان ہے۔ اچھی کتابیں کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا اس کا خاص مقصد ہے۔ تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے

ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ جس سے اردو پڑھانے، پڑھنے سیکھنے سکھانے کے مشکلات حل ہو جائیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت۔ ادبی کتابوں سے کم نہیں۔ کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہن انسانی کی ارتقاء و نشو و نما طبعی، انسانی علوم اور ٹیکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مربوط و مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے تاکہ اردو زبان کو فروغ ملے۔ اس زبان کی ترقی کے سلسلے میں جو رکاوٹیں اور دشواریاں پیش آتی ہیں یا اب تک ان دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا وہ دور ہو جائیں۔ اس زبان کے ساتھ ہمیشہ تعصبانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ خواہ علاقائی ہو، مذہب کے ساتھ جڑا ہوا ہو یا کسی اور وجہ سے اس کے ساتھ نا انصافیاں اور ناروا سلوک کیا گیا اُس کا ازالہ ہو سکے۔

فروع اُردو کے لیے چند تجاویز

(۱) پرائمری، مڈل اور ثانوی سطحوں پر اُردو پڑھانے کے لیے اردو سند یافتہ اور تجربہ کار اساتذہ کا انتظام کرنا ضروری ہے۔ طلباء کو اردو کی طرف راغب کرنے کے لیے معقول وظیفہ جات کا ہونا لازمی ہے۔

(۲) ابتدائی سطح سے گریجویٹ سطح تک اردو زبان لازمی قرار دی جائے اور اس

کے اس اختیاری پن کو ختم کیا جائے۔

(۳) سکولوں اور کالجوں میں اردو میگزین طبع کئے جائیں تاکہ طلبہ اس زبان میں اپنا حصہ ادا کر سکیں اور دلچسپی بڑھ جائے۔

(۴) اردو میں تمام مضامین کی درسی کتابوں کی طباعت اور فراہمی کا انتظام کیا جائے۔

(۵) ضروری قوانین، قواعد اور احکامات اردو زبان میں شائع ہوں۔

(۶) سڑکوں اور دفاتر پر اردو میں بورڈ لگائے جائیں۔

(۷) علاقائی سطح پر جو امتیازی سلوک اس کے ساتھ کیا جا رہا ہے اس کو کم کیا جائے اور ایسے علاقوں میں جہاں اس زبان کے پڑھنے سے بچے کتراتے ہیں وہاں اچھے اور قابل اردو جاننے والے مدرسین تعینات کئے جائیں۔

(۸) عدالتوں، دفاتر اور اسمبلی میں سرکاری کام کاج اردو زبان میں ہونا چاہیے۔

(۹) تحقیق کرنے والے حضرات کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے پوری پوری مالی امداد ملنی چاہیے تاکہ وہ اپنے تحقیقی مقالوں کو اردو میں شائع کر سکیں اور ان کو فوری طور پر روزگار مل سکے۔

(۱۰) سکولوں اور کالجوں میں مجلس مذاکرات اور محفل مشاعرہ اردو زبان میں منعقد کئے جائیں۔

(۱۱) تمام محکموں کے سربراہوں کے لیے اردو زبان کا علم ہونا ضروری و مستراردیا جائے تاکہ یہ زبان عام دفاتر میں استعمال کی جائے۔

(۱۲) ضلعی لائبریریوں میں اردو کتابیں رکھی جائیں تاکہ عوام آسانی کے ساتھ

اردو پڑھیں اور سمجھیں اور علمی مواد حاصل کریں۔

اردو خواہاں پر بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے
حتی الامکان کوشش کریں۔ کیونکہ اردو زبان ہماری، آپ کی، سب کی زبان ہے۔
اس کی خدمت کرنا اور اسے ترقی دینا ہمارا فرضِ اولین ہے۔

مرزا داغ فرماتے ہیں ۔

اردو ہے نام جس کا ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے



UNIT II

Methods

یونٹ (۲) میتھڈس

دو سراحصہ۔ دوسری اکائی

”طریقہ ہائے تدریس“

قوم را سرمایہ است اے صاحبِ نظر
نہیت از نقد و قشاش و سیم و زر

مالِ او فرزند ہائے تندرست
تڑ دماغ و سخت کوش و حیاق و پُست

علامہ اقبالؒ

طریقہ ترجمہ یا گرائمر طریقہ

(Translation Method)

دوسری زبانیں سکھانے کے لیے ترجمے کا طریقہ تجویز کیا گیا ہے۔ ترجمے کے ذریعہ زبان سکھانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے بنیادی جملے کی تشریح کی جائے۔ اگر اس جملے یا عبارت کا تعلق کسی واقعے یا حادثے سے ہے تو اس کی وضاحت ضرور کرنی چاہیے۔ اس دوران زبان کی مشکلات کو بھی دور کرنا چاہیے۔ لفظ، محاورہ اور مشکل تراکیب کی بھی تشریح کرنا ضروری ہے۔ نیز اس کا مفہوم سمجھنا لازمی ہے اس سے تدریس کا کام آسان ہو جاتا ہے۔

طریقہ ترجمہ پڑھنا، لکھنا سکھانے کا قدیم طریقہ ہے۔ اس میں حروف تہجی، بچے اور لکھائی و پڑھائی پر زور دیا جاتا ہے اس لیے اس طریقہ کار کو پڑھانے کا کلاسیک طریقہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس طریقہ کار سے بیرونی زبانیں پڑھائی جاتی ہیں۔ مطلب یہ کہ اس طریقہ سے جو زبان ہم پڑھانا چاہتے ہیں اس زبان کا ترجمہ پہلے آسان زبان میں یعنی وہ زبان جس پر ہمیں عبور ہوتا ہے ترجمہ کرتے ہیں۔ جس سے بچوں کو زبان فہم میں آتی ہے مثلاً انگریزی یا عربی یا فارسی وغیرہ وغیرہ زبانیں ہم اُردو زبان یا کشمیری زبان کے ذریعہ بچوں کو سمجھاتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ مدرس کو دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہو یعنی مقصدی زبان اور مترجم زبان۔ مقصدی زبان کو ہم انگریزی زبان میں Target Language کہتے ہیں۔ اس لیے یہ طریقہ دوسری زبان سکھانے کا مؤثر، آسان، جلدی اور سودمند ذریعہ ہے۔ نیز اس

طریقہ سے طلباء قواعد یعنی گرائمر سے بھی باخبر ہو جاتے ہیں اسی لیے اس کو گرائمر طریقہ بھی کہتے ہیں۔ مگر یہ طریقہ اونچی جماعتوں خاص کر گریجویٹ سطح پر طلباء کے موافق ہے نہ کہ تحتانوی سطح پر۔

اس طریقہ تعلیم کے اصول اور گرمندر جہ ذیل ہیں اور طالب علم اور مدرس کو ان باتوں پر خاص خیال رکھنا لازمی ہے۔

۱۔ پیرا گراف یا عبارت میں پڑھے ہوئے الفاظ کی ساخت اور بناوٹ اور لغوی معانی بخوبی سمجھے اور مدرس طلباء کو الفاظ کے لغوی معانی سے واقف کرائے گویا کہ طلباء کو معلوم سے نامعلوم کی طرف لینا ہے۔

۲۔ جملے صاف، مختصر اور آسان لکھے جائیں۔

۳۔ ترجمہ کرتے وقت غیر ضروری الفاظ حذف کئے جائیں تاکہ ترجمہ صاف، سلیس اور شستہ ہو جائے۔

۴۔ اصلی عبارت کے خیالات اور مقاصد کو کسی بھی صورت میں فوت نہ ہونے دیا جائے۔

۵۔ پسج یا عبارت کا سپرٹ بحال رکھا جائے۔

۶۔ جملوں کو عملی کام میں لانے کے لیے اور ان کی ساخت قائم رکھنے کے لیے ضروری الفاظ جمع کئے جائیں تاکہ ترجمہ صحیح طور ہو سکے۔

۷۔ اس طریقہ تعلیم کے لیے ماہر اور عالم اساتذہ کی ضرورت ہے۔

محاسن

اس طریقہ تعلیم کے طلباء میں مندرجہ ذیل خوبیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔

۱۔ طلبہ آسانی سے کوئی بیرونی زبان سمجھنے کے قابل بن جاتے ہیں۔ نیز ترجمہ شدہ کتاب یا زبان پڑھنے اور سیکھنے کا شوقین بن جاتا ہے۔ نیز طلبہ کی کامیابی اس

طریقہ تعلیم میں مضمر ہے۔

۲۔ اس طریقہ تعلیم سے طلباء فرہنگ سمجھنے اور یاد رکھنے کے اہل بن جاتے ہیں گوکہ علم لغت کی فراوانی ہو جاتی ہے۔

۳۔ اس طریقہ تعلیم سے طلباء مستند علوم پڑھنے اور ان کا مفہوم سمجھنے کے قابل بن جاتے ہیں۔

۴۔ اس طریقہ تعلیم سے طلباء مسودے، رسالے، اخبارات اور میگزین وغیرہ پڑھنے اور سمجھنے کے اہل بن جاتے ہیں۔

۵۔ اس طریقہ تعلیم سے محاورات، ضرب الامثال اور نئے نئے الفاظ کے معانی اور جملہ سازی کی مہارت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ محاورات اور ضرب الامثال وغیرہ دوسری زبان میں منتقل کرنے پڑتے ہیں۔

۶۔ اس طریقہ تعلیم سے طلباء کو بولنے کے بجائے لکھنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ جس سے خوش نویسی اور زود نویسی کی تربیت ملتی ہے۔

۷۔ اس طریقہ تعلیم سے قوت فکر، قوت تخیل اور قوت ادراک کی صحیح تربیت ہو جاتی ہے کیونکہ طلباء کو اپنی قوت ذہن سے کام لینا پڑتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اس طریقہ تعلیم میں اونچے ذہن کی ضرورت ہے۔

۸۔ اس طریقہ تعلیم سے طلباء دونوں زبانوں یعنی (مقصدی زبان اور طلباء کی مادری زبان خواہ مادری زبان کوئی بھی ہو) کے قواعد یعنی گرائمر اور صرف و نحو سے باخبر ہو جاتے ہیں۔

۹۔ یہ طریقہ تعلیم دوسری زبان سیکھنے کا موثر، آسان اور سودمند ذریعہ رہتا ہے۔ اور طالب علم ان زبانوں کا آپس میں موازنہ بھی کر سکتے ہیں۔

۱۰۔ اس طریقہ تعلیم سے معلم اور شاگرد پڑھانے اور سیکھنے کا عمل جاری رکھتے

ہیں۔

۱۱۔ دوسری زبان جاننے والے کو اپنا مفہوم سمجھانے کا یہ نہایت جامع طریقہ ہے۔ محاسن جو اوپر بیان کئے گئے وہاں یہ طریقہ تعلیم مصائب سے مُبرّا نہیں۔ مصائب جن کا ذکر مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ اس طریقہ تعلیم کے ذریعے گفتگو نہیں سیکھی جاسکتی اور جب تک بات چیت اور گفت و شنید پر قدرت حاصل نہ ہو، پڑھنے اور لکھنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے۔

۲۔ اس طریقہ تعلیم سے ہر لفظ کا مترادف دوسری زبان میں نہیں ملتا کیونکہ ہر زبان کی صرف و نحو مختلف ہوتی ہے۔ اگر ایک زبان کی صرفی خصوصیات دوسری زبان میں موجود نہ ہوں تو ترجمے میں دشواری ہو سکتی ہے۔

۳۔ یہ طریقہ تعلیم پُرانا اور فرسودہ ہے۔ اس میں حروفِ تہجی، ہجے اور لکھائی و پڑھائی پر زور دیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے کی صلاحیت کے باوجود صحیح تلفظ، لب و لہجہ اور روزمرہ کی بات چیت کی صلاحیت نہیں پیدا ہو پاتی۔

۴۔ اس طریقہ تعلیم سے طلبہ پہلے اپنی مادری زبان میں (خواہ اُن کی مادری کوئی بھی زبان ہو) سوچتے ہیں پھر اپنے خیال کو دوسری زبانوں میں منتقل کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ایسے جملے بتاتے ہیں جو مذاق پیدا کرتے ہیں مثلاً کشمیر کے حوالے چند مثالیں پیش ہیں۔

دروازہ بند کرنا (دروازہ دیدو) مجھے یہ لکھنا نہیں آتا (مجھے یہ لکھنا اُٹھتا نہیں) وغیرہ

۵۔ ایک اور خامی یہ بھی ہے کہ طلبہ کلاس میں زیادہ تر اُستاد کی طرف متوجہ نہیں رہتے ہیں وہ بس سنتے جانتے ہیں۔

۶۔ کبھی ترجمہ کرنے سے جملے یا عبارت کا اصل مفہوم زائل بھی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہر لفظ کا ترجمہ یا معنی تلاش کرنا پڑتا ہے جس میں ترجمہ کرتے وقت کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۷۔ معلم کو دونوں زبانوں پر پورا پورا عبور ہو۔ اسی وقت ترجمہ صحیح ہو سکتا ہے جب مترجم دونوں زبانوں کا عالم ہو ورنہ ترجمہ کرنے میں کافی دشواری آتی ہے۔

۸۔ ترجمہ کرنے میں کافی وقت خرچ ہوتا ہے کیونکہ سوچ سمجھ کر ایک زبان دوسری زبان میں منتقل کرنی پڑتی ہے جس کے لیے قوائے ذہن سے کام لینا پڑتا ہے اور وقت لگتا ہے۔

چونکہ اوپر بھی بیان کیا گیا کہ یہ طریقہ تعلیم ثانوی اور فوقانی طبقوں کے لیے مناسب اور موزوں رہتا ہے جب کہ تحتانوی اور ابتدائی جماعتوں میں اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا ہے اور نہ بچوں کا ذہن اس قابل ہوتا ہے کہ وہ ابتداء سے ہی ترجمہ کرنے کے قابل بن جائیں۔

محاسن اور مصائب کا موازنہ کرتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ طلباء کو پڑھانے اور سکھانے کے لیے ہر طریقہ تعلیم مفید ہے۔ اس لیے ہم کسی بھی طریقہ تعلیم سے دست بردار نہیں ہو سکتے ہیں۔ طریقہ ترجمہ کا جہاں تک تعلق ہے یہ طریقہ تعلیم اونچی جماعتوں میں اپنا سکتے ہیں اور اسی طریقہ سے مختلف علوم طلبہ تک پہنچا سکتے ہیں۔ ورنہ مختلف علوم کی جانکاری حاصل کرنا ناممکن ہے۔ اس طریقہ تعلیم نے تعلیم کے میدان میں ہر دلعزیزیت حاصل کی ہے۔

اس طریقہ تعلیم کے پیچھے جو فلاسفی موجود ہے وہ یہ ہے کہ ہر کوئی زبان ہم طریقہ ترجمہ سے ہی سیکھتے ہیں۔ اور مختلف زبانوں کے ماہر بن جاتے ہیں۔

اگر کوئی انسان دنیا کے کسی ملک باعلاقے میں جائے تو ترجمہ کے ذریعے ہی اس

ملک یا علاقہ کی زبان سمجھتا ہے۔ اس لیے اس کا اطلاق ثانوی کلاسوں سے ہی ہونا چاہیے تاکہ بچے زبان دان اور زبان فہم بن جائیں۔ ماہرانِ تعلیم اس طریقہ تعلیم کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ زمانہ قدیم سے بیرونی زبانیں مثلاً عربی، فارسی، حبشہ، فرانسیسی، انگریزی اور سنسکرت وغیرہ اسی طریقہ تعلیم سے پڑھائی جاتی تھیں اور پڑھائی جاتی ہیں۔ تاہم تحتانوی کلاسوں میں اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

طریقہ راست (Direct Method)

اس طریقہ تعلیم سے وہ زبان جو پڑھانی مقصود ہو براہ راست اُسی زبان میں پڑھائی اور سکھائی جاتی ہے۔ اور وہی ذریعہ تعلیم مانی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم اردو زبان اردو میں ہی پڑھاتے ہیں۔ اس طریقہ تعلیم میں کسی اور زبان کا استعمال نہیں کیا جاتا ہے۔ اس لیے باقی طریقہ ہائے تعلیم سے بالکل مختلف ہے۔ اس طریقہ تدریس کے تحت عمل اور زبانی اظہار ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ مثلاً کسی غیر ملکی کو اگر طریقہ راست سے اردو سکھانا مقصود ہو تو مقرر وہ اشیا دکھا کر کہیں گے کہ یہ کیا ہے؟ وہ کون ہے؟ مثال کے طور پر قلم یا کتاب یا انسانی جسم کا کوئی اعضاء دکھا کر زبانی بول چال کے ساتھ اور سوال و جواب کا طریقہ اپنا کر اردو کے الفاظ اور جملوں سے واقفیت پیدا کرائی جاسکتی ہے۔ جب الفاظ اور جملوں کی مشق ہو جائے تو پڑھائی اور لکھائی سے اس کا ارتباط کیا جاسکتا ہے۔ الفاظ سے واقفیت پیدا کرنے کی وجہ سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ پڑھتے وقت الفاظ اور علامتوں کے درمیان مطابقت پیدا کرتے وقت سہولت ہوتی ہے۔

الفاظ اور جملے سیکھنے میں طریقہ راست سے بہت مدد ملتی ہے اور موضوع اور الفاظ کے براہ راست ربط سے ٹھوس اشیا اور محسوس افعال کے معنی سمجھائے جاسکتے

ہیں۔ اسی طرح کس شے اور واقعے کو بھی خیالی ربط دیا جاسکتا ہے۔ اسی لیے ماہرین تعلیم اور تربیت یافتہ مدرس صاحبان یہ طریقہ تعلیم اپنانے پر زور دیتے ہیں۔ کیونکہ مقصودی زبان پڑھنے اور سیکھنے کے لیے یہ طریقہ تعلیم بہت کارآمد اور مفید ہے۔ طلباء اس طریقہ تعلیم سے بہت تیزی کے ساتھ مقصودی زبان سیکھنے کے قابل جاتے ہیں۔ چنانچہ "Welter's New International Dictionary" کے مطابق ”اس طریقہ تعلیم سے طلبہ نئی زبان یا مقصودی زبان میں گفتگو، بحث و مباحثہ اور بول چال وغیرہ جلد از جلد سیکھتا ہے“۔

Professor Gurrey says, "Direct Method is a principle, a system that operates through many methods, a way of handling the new language and presenting to the class. It demands direct bond that is a direct association between word and a thing, and between sentence and an idea- instead of an indirect one through the mother tongue".

طریقہ راست کے بنیادی اصول

۱۔ زبانی بول چال جو ایک مبتدی کے لیے بہت اہم ہے اس طریقہ تعلیم میں موجود ہے۔

۲۔ مطلوبہ زبان، مطلوبہ زبان میں ہی پڑھائی اور سکھائی جاتی ہے۔

۳۔ مقرون سے مجزہ کی طرف جانے کا اصول موجود ہے۔

۴۔ آسان سے مشکل کی طرف۔

۵۔ منطق سے استدلال کی طرف۔

۶۔ خاص سے عام کی طرف، یعنی خاص خاص واقعات پہلے بتائے جاتے ہیں اور

عمومی بحثیں بعد میں چھیڑی جاتی ہیں۔

۷۔ غیر معین اور غیر واضح تصورات کو معین اور واضح کیا جاتا ہے۔ یعنی طلبہ کے غلط اور ناقص تصورات کو ٹھیک اور واضح کرانے کے لیے تصاویر، نقشہ جات، توضیح اور مثالوں سے مدد لی جاتی ہے۔

۸۔ سادی سے پیچیدہ کی طرف: یعنی ہر سبق میں سادہ تصورات پہلے لئے جاتے ہیں۔ پھر بتدریج پیچیدہ باتیں سمجھائی جاتی ہیں۔

۹۔ اس طریقہ تعلیم میں ضرورت کے مطابق علم لغت محدود انداز میں طلبہ کی ضرورت اور تجربہ کے مطابق اپنایا جاتا ہے۔

۱۰۔ معلوم سے نامعلوم کی طرف: یعنی نئی بات یا نامعلوم بات تب تک ذہن میں جم نہیں جاتی جب تک کہ یہ گذشتہ تجربہ یا معلوم بات کے ساتھ گہرے طور پر پیوستہ نہ ہو۔ اسی اصول کی ترجمانی اس مقولے سے کی جاتی ہے اور طریقہ راست میں یہ اصول مضمر ہے۔

۱۱۔ کل سے جز کی طرف: نفسیات یہ بتاتا ہے کہ کسی چیز کے ادراک میں ہم پہلے اس چیز کی شناخت بحیثیت ایک مکمل اکائی کے کرتے ہیں اور پھر اس کے اجزاء کی طرف دھیان دیتے ہیں اور ان میں تمیز کرتے ہیں۔

محاسن

اس طریقہ تعلیم سے طلبہ حسب ذیل محاسن سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

۱۔ یہ طریقہ تعلیم اپنانے سے طلبہ میں گفتگو اور بول چال کی عادت بڑھ جاتی ہے۔ اس وجہ سے طلبہ کا تلفظ ٹھیک ہوتا ہے۔ نیز مدرس بچوں کو اردو محاورات اور تراکیب اچھی طرح سمجھا سکتا ہے۔

۲۔ چونکہ اس طریقے سے خیال اور بیان کا آپس میں گہرا ربط رہتا ہے جس وجہ

سے طلبہ کی زبان میں روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے طلبہ کو زبان پر پوری دسترس حاصل ہو جاتی ہے۔

- ۳۔ کوئی بھی مطلوبہ زبان راست طریقہ سے سمجھانے میں آسانی ہو جاتی ہے۔
- ۴۔ یہ طریقہ تعلیم مدرس کے لیے وقت بچاؤ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔
- ۵۔ اس طریقہ تعلیم سے عملی گرائمر پر زور دیا جاتا ہے نہ کہ گرائمر کی تھیوری پر۔
- ۶۔ اس طریقہ تعلیم سے جملے بولنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور مخصوص فرہنگ کا استعمال بھی ہوتا ہے۔ جس سے الفاظ اور جملے سیکھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔
- ۷۔ موضوع اور لفظ کے براہ راست ربط سے ٹھوس اشیاء اور محسوس افعال کے معنی سمجھائے جاسکتے ہیں۔

۸۔ یہ طریقہ بنیادی کلاسوں اور ثانوی کلاسوں میں اپنایا جاسکتا ہے۔
غرض پڑھانے کے بہت سے طریقے ہیں ان طریقوں میں راست طریقہ بھی ایک ایسا بہتر اور سودمند طریقہ مانا جاتا ہے جس سے طلبہ ہر صورت میں مستفید ہو سکتے ہیں۔ نیز ماہرین تعلیم اور تجربہ کار مدرس صاحبان اس طریقہ کار کو اپنانے کی اجازت دیتے ہیں۔

جہاں پر راست طریقہ سے فائدے بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ وہاں خامیوں یا نقائص سے بھی خالی نہیں ہے۔ ذیل میں چند خامیاں یا نقائص درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ چونکہ اس طریقہ تعلیم میں مطلوبہ زبان کے بغیر کسی اور زبان خواہ وہ مادری زبان ہی کیوں نہ ہو استعمال کرنے کی اجازت نہیں، اس لیے اُستاد ایسا ہونا چاہیے جس کو پڑھانے والی زبان یعنی اردو زبان پر پورا عبور حاصل ہو۔

۲۔ یہ طریقہ تعلیم زیادہ تر گفتگو اور بول چال پر زور دیتا ہے جس وجہ سے کسی حد

تک لکھائی اور مطالعہ اثر انداز ہوتا ہے۔

۳۔ اس طریقہ کار کے ذریعے طلبہ کو مقرون اشیاء مثلاً تصاویر، ماڈل، نقشے اور خاکے وغیرہ دکھا کر پڑھایا جاتا ہے جس کے لیے یہ تدریسی مواد یا تو تیار کرنا پڑتا ہے یا بازار سے خرید کر کے لانا پڑتا ہے۔ اس تیاری کے لیے روپیوں، پیسوں اور مواد وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے جو کہ بعض اوقات قوت خرید سے باہر ہو جاتا ہے اور مدرس بر محل اور موزون تدریسی مواد طلبہ کو وقت پر نہیں دکھا سکتا ہے۔ طلبہ اثر انداز ہو جاتے ہیں۔

۴۔ بعض اوقات یہ طریقہ تعلیم بنیادی سطح پر مشکلات پیدا کرتا ہے کیونکہ بچوں کا ذہن پہلے ہی سے کچھ نیچا ہوتا ہے۔ اس لیے مدرس کو اس سطح پر بچوں کو اس طریقہ کار سے پڑھانے اور سکھانے میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔

ہر طریقہ تعلیم خوبیوں اور خامیوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ طریقہ راست بھی خوبیوں اور خامیوں سے مالا مال ہے۔ جن کا ذکر اوپر ہو چکا۔ پس اساتذہ کو چاہیے کہ وہ حسب ضرورت ابتدائی درجوں میں کچھ ترامیم و اضافوں سے کام لیں، جب کہ یہ طریقہ کار اعلیٰ کلاسوں کے لیے سب سے اچھا اور بہترین طریقہ ہے۔

کھیل کھیل طریقہ تعلیم

(Play way Method)

یہ ایک نفسیاتی اصول ہے کہ بچے سے نچلا نہیں بیٹھا جاسکتا۔ وہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا ہے۔ دورِ جدید کا اُستاد بچے کی فطرت کا مطالعہ کر کے اسکول میں اُس کے لیے ایسا حسبِ مراد ماحول تشکیل دیتا ہے کہ وہ گھر اور اسکول میں کاموں اور ہنگاموں کے لحاظ سے کوئی فرق محسوس نہیں کر پاتا۔ بلکہ روزِ روز وہ سکول کی فضا سے مانوس ہوتا جاتا ہے اور سکول کو اپنے گھر پر ترجیح دے کر سکول کے ہر کام میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ کیوں نہ ہو اُسے مختلف چیزوں کے دیکھنے، چھونے، جانچنے، جوڑنے، اُٹھانے، گرانے، گھمانے، پھینکنے، تولنے، ناپنے یا سنبھالنے کا نہ صرف موقعہ دیا جاتا ہے بلکہ ان کاموں میں پھرتی اور چستی دکھانے پر اس کا حوصلہ بھی بڑھایا جاتا ہے۔ اچھا اُستاد ان باتوں پر نگاہ رکھ کر اس کی فطرت کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے اور بچے کی پوشیدہ قوتوں کو اُجاگر کرنے اور انہیں ترقی دینے کے منصوبوں پر عمل کرتا ہے۔ اسے کتاب سے الگ رکھ کر زندگی کی مفید اور صحتمند قدروں پر ڈال دیتا ہے۔ اور ابتداء ہی سے بچے کے لیے وہ راستہ ہموار کرتا ہے۔ جس پر چل کر تعلیم زبان اور اُس کے مقاصد کا حصول آسان بن جائے۔ اچھا اُستاد اس نفسیاتی صداقت پر یقین رکھتا ہے کہ گفتگو اور مشغلہ وہ ذریعہ ہے جس سے بچے کی شخصیت اور شخصِ نمود کی قوت اُبھرتی ہے اور اس کے حواسِ خمسہ کی دُرست تربیت کے پیہم مواقع پیدا ہو سکتے ہیں۔ وہ یہ عقیدہ بھی رکھتا ہے کہ ایسے مواقع پیدا کرنے کی

ضمانت صرف مشاغل میں موجود ہے اور مشاغل کے لیے بچوں کے دل میں شوق اور ولولہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے بچوں کے دل میں مختلف مشاغل کی ترغیب پیدا کی جائے۔ تاکہ وہ اپنی تعلیمی زندگی شروع کرنے کے ساتھ ہی مختلف مشاغل میں دلچسپی لے سکیں۔ یہ تعلیم کا ماننا ہوا اصول ہے کہ درست اور دیر پا تعلیم حواسِ خمسہ استعمال کئے بغیر ممکن نہیں اور حواسِ خمسہ کی ترقی مشاغل یا ایکٹیوٹی میں حصہ لیے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی۔ غرض دماغ کی مجموعی ترقی حواسِ خمسہ کی تربیت اور ترقی کے تابع ہے۔ اس لیے یہ ضروری بن جاتا ہے کہ مشاغل یا کسی چُنے ہوئے کام کو مرکزِ سبق بنایا جائے۔ تاکہ حواس کی مکمل تربیت ہو سکے۔ ہر اُستاد کو معلوم ہونا چاہیے کہ حواسِ خمسہ کی تربیت اور ترقی دماغ کی مجموعی ترقی اور تربیت سے عبارت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد بچے کو کتاب پر قربان کر کے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

کھیل کی اہمیت

کھیل کے ذریعہ جسمانی عضلات اور قوتوں کی نشوونما ملتی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ جسم کے اعضاء حرکت میں آسکتے ہیں۔ جبلیوں کے اظہار میں ذہانت تعاون کرتی ہے اور ذہانت کو خوب مشق ملتی ہے اور عقلی قوتوں کو خاموشی کے ساتھ لڑانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ساتھ ہی بچوں میں ایک اجتماعی سپرٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر بچہ ذاتی منفعت یا ذاتی خود نمائی کو جماعتی بھلائی پر قربان کرتا ہے۔ اس کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ اُس کی جماعت ہر حالت میں جیتے اور مد مقابل جماعت ہار جائے۔ نیز بچوں میں بلند کردار پیدا ہو جاتا ہے۔ محنت و مشقت اور خوب تیاری کی عادت پڑتی ہے۔ خود اعتمادی اور ارادت کی قوتوں کو نشوونما ملتی ہے۔ کھیل کے ذریعہ بھائی چارہ اور تعاون کا جذبہ بڑھتا ہے۔ اونچ نیچ کا خیال کا فور ہو جاتا ہے۔

سچ بولنا، ہمدردی، خوش کلامی اور جذبات کا توازن جیسے صفات جنم لے رہے ہیں۔ کھیل

اعلیٰ درجے شوق مشاغل (Hobbies) کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ اور ان مشاغل میں بہت سے تخلیقی، علمی اور صنعتی مشاغل شامل ہیں۔ کھیلوں کے ذریعہ تقلیدی اور تعمیری جبلتیں بھی حرکت میں آتی ہیں۔ کھیلوں کے ذریعہ بچوں کے تخیل اور استدلال کی قوتوں کو تقویت ملتی ہے۔

کھیلوں کے مختلف نظریات

ماہرین نفسیات نے کھیل کے بارے میں جو مختلف نظریات پیش کئے ہیں ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ فاضل قوت کا اظہار: اس نظریہ کے مطابق کھیل کے ذریعہ بچہ اپنی فاضل طاقت کا اظہار کرتا ہے۔ تندرست اور طاقتور بچوں میں کھیل کا میلان زیادہ پایا جاتا ہے۔

۲۔ تفریحی نظریہ: اس نظریہ کے مطابق دن بھر کا تھکا ماندہ، دماغی یا دستی مزدور جسم میں تروتازگی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ لہذا کھیل میں دلچسپی لیتے ہیں۔

۳۔ آئندہ زندگی کی تیاری: کھیل آئندہ زندگی کو اچھی طرح بسر کرنے کے لیے تیار کر لیتی ہے۔

۴۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ رجحانات اور جبلتیں ہمارے حیاتیاتی ورثہ میں ہیں، جو ہمیں اپنے بزرگوں سے ملی ہیں۔ اس لیے جبلتیں ہمارے انسانی تجربات میں موجود ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق انسان ان تمام مرحلوں سے گزرتا ہے۔ جن مرحلوں سے نسل انسانی پیدائش سے لے کر ترقی کرتے کرتے موجودہ درجہ تک پہنچتی ہے۔ انسان کو کبھی کبھی دوڑنے، کودنے، اچھلنے اور رینگنے کے مواقع ملتے ہیں۔ کھیل کے ذریعہ وہ اسی ورثہ کو دہراتا ہے اس کو انسانی تہذیبی ترقی کے نظریہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۵۔ کاہلی سے بچنا: انسان کاہلی سے نفرت کرتا ہے اور اُس سے بچنے کے لیے کھیل کھیلتا ہے اور کھیل میں شریک ہوتا ہے۔

۶۔ حیاتیاتی نظریہ: اس کے رو سے کھیل سے انسانی وجود کی نشوونما ہوتی ہے۔ بچے ایسے کھیل کھیلتے ہیں جن سے ان کی رگوں اور پٹھوں کو حرکت ملتی ہے۔ لہذا اُن کی تقویت ایک قدرتی امر ہے۔

۷۔ رشک کا نظریہ: اس نظریہ کی رُو سے انسان دوسروں پر سبقت لینے کے لیے کھیلوں میں دلچسپی لیتا ہے۔ وہ دوسروں سے اپنے کو بڑھ چڑھ کر دکھانے کی مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اوپر کے نظریات کے مطالعہ سے واضح ہے کہ کوئی بھی نظریہ مکمل نفسیاتی تشریح پیش نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی کھیل کی اہمیت اس سے کم نہیں ہوتی ہے۔ کھیل بچوں کا محبوب ترین مشغلہ ہی نہیں بلکہ زندگی کی علامت، صحت و طاقت کا ضامن، نشوونما میں معاون اور تعلیم و تربیت کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔

کھیل میں تعلیم

ایسا ہر عمل جو بچوں کی فطری رجحانات کو مؤثر طریقہ سے اظہار کو موقع دے کھیل کہلاتا ہے اور پھر تعلیم کو عملی طور پر سیکھنے کا دوسرا نام کھیل میں تعلیم ہے۔ بچے عملی کام یا دلچسپ کھیلوں کی مدد سے جو کچھ سیکھتے ہیں وہ اُن کے دماغ میں اچھی طرح جگہ پکڑتا ہے۔ اس طریقے سے بچے اپنے کام کو انجام دینے کے کئی نئے منصوبے تیار کرتے ہیں۔ وہ اپنے تخیل و دلیل اور فیصلہ کی قوت کو اس کام کی انجام دہی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح انہیں کافی ذہنی تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی وہ مل کر کام کرنا سیکھتے ہیں۔ ماہرین تعلیم کی رائے ہے کہ کھیل کا بچہ کی فطرت اور آزادانہ ماحول کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اس لیے انہوں نے کھیل کو

بچے کے جذبات، دل و دماغ اور جسم کی نشوونما کے لیے بہترین ذریعہ قرار دیا ہے۔ ابتدائی جماعتوں میں کھیل کھیل میں تعلیم دینے کے لیے ذیل میں کچھ سامان اور کھیل تجویز کئے جاتے ہیں۔

جسمانی صحت بنانے کے کھیل

کنڈرگارٹن کلاس کے لیے مانسٹوری طریقہ تعلیم پر زور دیا گیا ہے چونکہ مانسٹوری ایک اٹلین خاتون تھی جس نے جسمانی طور ناخیز بچوں کے لیے ایک طریقہ تعلیم کی بنیاد رکھی جو کہ مانسٹوری طریقہ تعلیم کے نام سے مشہور ہے اور کھیل کھیل طریقہ پر مبنی ہے۔

زبان دانی سکھانے اور لکھائی کے کھیل

(ا) گتے کے تاش، حروف اور گنتی کے مختلف چیزوں کے نام یا اُن پر چند چھوٹے چھوٹے جملے لکھ کر بچے تاش کھیلے ہیں اور حروف یا چیزوں کے نام پڑھتے ہیں۔ پھر اپنی کاپی پر نقل کرتے ہیں۔

(ب) ایسے کارڈ جن پر حکم لکھے ہوں یا کوئی نصیحت یا منع کی بات لکھی ہو مثلاً کھڑے ہو جاؤ، بیٹھ جاؤ، دوڑو، رُک جاؤ، تمباکو پینا بُری عادت ہے وغیرہ بچے کارڈ کو پڑھ کر حکم بجالاتے ہیں یا نصیحت پر عمل کرتے ہیں۔

(ج) کہانی سنانا، نظم گانا، ڈرامہ وغیرہ بچے کو اظہار کا موقعہ دیتے ہیں جس سے ان کا ذخیرہ الفاظ بڑھتا ہے۔

(د) تصویروں کو کاٹ کر چپے ہوئے مناسب اور موزون الفاظ اُن کے سامنے چسپان کرنا۔ اس کے علاوہ ذیل میں سامان کی ایک فہرست دی جاتی ہے جس کو استاد کھیل کے ذریعہ بچوں کو زبان دانی سکھانے میں استعمال کر سکتا ہے۔

۱۔ لکڑی یا گتے کے ملبے جن کے پہلوؤں پر حروف یا الفاظ یا نام لکھے ہوں۔

۲۔ جانوروں کی تصویریں کاغذ پر بنی ہوئی یا مٹی یا گتے سے کاٹی گئیں۔

۳۔ ریگ مال سے حروف کاٹنا۔

۴۔ حروف یا الفاظ کا ڈائل بنانا۔

۵۔ نصیحت آموز جملوں کا چارٹ۔

۶۔ حروف، الفاظ یا جملوں کا بائیسکوپ بنانا۔

۷۔ تصاویر کو دیکھ کر گتے پر لکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے جملوں کو ترتیب دینا تاکہ وہ ایک کہانی یا مضمون کی صورت اختیار کرے۔

۸۔ گتے یا پلے ووڈ کے 3×3 یا اسے کم رقبہ کے تختے پر حروف یا ناموں کا شطرنج کھینچنا اور بچوں کے ہاتھ اسی نوعیت کے حروف یا نام کے تاش دینا تاکہ وہ کھیل اور مشق کریں۔

۹۔ گتے کے تاش جن کے ایک طرف پرندوں، حیوانوں، اجناس، جسم کے اعضاء، ذرائع آمد و رفت، مکان اور اس کے ساز و سامان، کرہ جماعت اور اُس کے سامان، پیشہ وروں، کارخانوں اور اوزاروں وغیرہ کے نام اور دوسری طرف تصویر ہو۔

۱۰۔ لکڑی یا گتے کا گول دائرہ بنانا جس کے گرد حروف، نام، الفاظ یا احکام ہوں۔ بیچ میں سوئی لگی ہوئی ہو۔ سوئی کو گھما کر جہاں پرز کے، لڑ کے اُسی کو روز سے پڑھیں۔

۱۱۔ حروف کے نام یا تاش بچوں میں تقسیم کئے جائیں اور بورڈ پر چند الفاظ یا جملے لکھے جائیں پھر بچوں کو کہا جائے کہ وہ حروف کی مدد سے ایسے ہی الفاظ یا جملے بنائیں۔

۱۲۔ کتاب کے تختوں کو الفاظ کے تاش میں تقسیم کیا جائے، سبق پڑھا کر بچوں کو یہ تاش اٹھا کر ایک ایک جملہ بنانے میں مشغول کیا جائے۔ لڑ کے ساتھ ساتھ

خود تصحیح بھی کرتے جائیں۔

۱۲۔ بورڈ پر ایک کے نیچے ایک لفظ لکھتے اور ہر لفظ کا نمبر بھی رکھتے۔ کبھی نمبر پڑھتے کبھی لفظ۔ تاکہ بچے نمبر پڑھتے وقت لفظ زور سے پڑھیں۔ اور لفظ پکارنے پر نمبر پڑھیں۔

۱۳۔ بورڈ پر بے ترتیب لفظوں کا ایک مجموعی جن میں اسماء، افعال اور صفات وغیرہ ہوں لکھتے پھر بچوں کو کہیے کہ وہ جملے بنا سکتے ہیں، جگہ پُر سکتے ہیں وغیرہ۔
بچوں میں دلچسپی اور کھیل کا لطف پیدا کرنے کے لیے اُن کو دو حصوں میں تقسیم کر کے مقابلہ کروایا جائے، تاکہ کون جیتے اور کون ہارے۔
کھیل کھیل تعلیم کے اصول

(۱) کام ہی بڑا معلم ہے یعنی کرنے سے سیکھنا (Learning by doing)
مدرس جو بات طلبہ کو سکھانا چاہتا ہے وہ بار بار توضیح و تشریح کرنے کی بجائے طلباء کو فوراً اُس کے متعلق کام میں لگائے تاکہ کرنے سے وہ سیکھے۔

(۲) زندگی کے ساتھ منسلک (Related to Life)
کھیل کھیل طریقہ میں یہ ایک اہم اصول ہے کہ بچے کی زندگی کے ساتھ میل کھاتے ہوئے بچہ بڑی دلچسپی اور آزادانہ ماحول میں سیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اسکول اس کے لیے آزادانہ ماحول پیدا کر کے بچے کو کھیل کی طرف راغب کرتے ہوئے سکول سے غیر حاضر رہنے کی کوشش نہیں کرتا ہے۔ اس طرح سکول اس کے لیے مرغوب بنتا ہے۔

(۳) ہمدردانہ رویہ (Sympathetic Attitude)
یہ طریقہ تعلیم بچوں میں ہمدردانہ رویہ پیدا کرتا ہے اور ساتھ ہی ظالمانہ اور جابرانہ رویہ کے خلاف بچہ ہر روز سکول جانے کی کوشش کر کے اپنے میں یہ اچھی

عادت پیدا کرتا ہے۔

(۴) سکھانے کے طریقے (Methods of Teaching)

اس اصول کے بارے میں پہلے ہی سیر بحث کی گئی کہ بچوں کو کس طرح اور کن کن طریقوں سے سبق پڑھایا اور سکھایا جاتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے اور ماہرین تعلیم کی رائے ہے کہ یہ طریقہ تعلیم پُرانے اور فرسودہ ہائے طریقہ ہائے تعلیم کے برعکس ہے اور جدید طریقوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

(۵) مواقع پیدا کرنا (Opportunities)

یہ طریقہ تعلیم بچوں کے لیے سیکھنے کے مواقع پیدا کرتا ہے۔

(۶) انفرادیت (Individuality)

اس طریقہ تعلیم سے بچوں میں سیکھتے وقت انفرادیت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی اپنی انفرادی عظمت کو بڑھانے کی کوشش کرتا ہے اور مدرس کی رہنمائی میں فرداً فرداً سب بچے سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اصولوں کے ساتھ ساتھ اس طریقہ تعلیم کی اپنی افادیت بھی ہے۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں:

افادیت یا محاسن (Advantages of Play way Method)

(۱) قدرتی میلان یا رغبت (Natural Motivation)

اس طریقہ تعلیم سے بچوں میں قدرتی طور پر کھیل کی طرف آمادگی آتی ہے۔ کھیل کا شوقین ہونا بچوں کی فطرت ہے اس لیے بچے اس طریقہ تعلیم سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ اظہار خوشی اور اطمینان سے بچے سیکھتے ہیں۔

(۲) ہمہ تن (Whole heartedness)

اس طریقہ تعلیم سے بچے خود اعتماد بنتے ہیں اور اپنے کام میں سنجیدگی دکھاتے

ہیں۔ جب دل اور ذہن سنجیدہ ہو تو کام یا تعلیم بھی سنجیدہ ہے۔

(۳) متوازن شخصیت کا حامل (Balanced Development of Personality)

یہ طریقہ تعلیم بچے کی شخصیت کے لیے باعث نمو ہے اور بچہ اپنی شخصیت متوازن طور بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ نیز اس کا ذہن سماجی، جذباتی اور اخلاقی طور تربیت حاصل کرتا ہے۔

(۴) خود ضبطی (Self Discipline)

خود ضبطی سے مراد اپنے آپ میں سنجیدہ پن لانا۔ اندرونی طور کام کے ساتھ مگن رہنا۔ کھیل کھیل سے بچوں میں ایسی دلچسپی پیدا ہوتی ہے کہ اُس کو بیرونی دباؤ سے کوئی خلل واقع نہیں ہو جاتا ہے۔

(۵) محسوساتی اعضاء کی تربیت پس پشت نہیں رہتی

(Training of the sensory organs is not ignored)

اس طریقہ تعلیم سے بچے کے محسوساتی اعضاء تربیت پاتے ہیں۔ جسم کے تین "H" یعنی Head, Hand and Heart (دماغ، دل اور ہاتھ) جو کہ تینوں محسوساتی اعضاء میں شامل ہیں اور انسانی جسم میں محسوس کرنے میں بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں اس طریقہ تعلیم سے ان تینوں اعضاء کو تربیت ملتی ہے۔ اس طرح بچہ اپنی تعلیم آگے بڑھانے میں کوشاں رہتا ہے۔ مستقبل میں سماج کے لیے قابل کار فرد بنتا ہے۔

(۶) خود بہتری یا خود سداہار (Self Advancement)

اس طریقہ تعلیم سے بچہ خود تعلیم حاصل کر کے اپنے آپ میں سداہار لاسکتا ہے جس سے اس کی تعلیم اور کردار میں بہتری پیدا ہو کر قوم کے لیے باعث شمع بنتا ہے۔ مندرجہ بالا فوائد یا محاسن مد نظر رکھتے ہوئے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ کھیل

کھیل طریقہ بچوں کو پڑھنا اور لکھنا سکھانے کے لیے اچھا اور موزون طریقہ ہے۔ اسی لیے یہ طریقہ کار جدید طریقہ ہائے کار میں شامل ہے۔

جہاں اس کے فوائد بہت ہیں وہاں خامیوں یا مصائب سے مبرا نہیں۔ جن کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

مصائب

۱۔ ہر استاد یا معلم اس قابل نہیں کہ وہ کھیل کھیل طریقہ سے بچوں کو پڑھنا اور لکھنا سکھائے۔ اس کے لیے برداشت کی صفت سے متصف اساتذہ کی ضرورت ہے۔ اسی لیے مانسٹوری نے بھی یہ طریقہ تعلیم پڑھانے اور سکھانے کے لیے استانیوں کو تعینات کرنے کی سفارش کی ہے۔

۲۔ اس طریقہ تعلیم کو اپنانے کے لیے سامان، تجربہ گاہوں، کرسیوں، بچوں کے لیے موزون کمروں اور دیگر مواد تدریس کا ہونا ضروری ہے تاکہ یہ طریقہ تعلیم بچوں کے لیے کامیاب رہے جب کہ ایسا تدریسی مواد حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور اسکے لیے روپیوں اور پیسوں کی ضرورت ہے۔

۳۔ اس طریقہ تعلیم سے مضامین الگ الگ پڑھائے جاتے ہیں جس سے وقت کافی صرف ہوتا ہے۔

۴۔ اس طریقہ تعلیم سے ذہنی تربیت تو ملتی ہے مگر بچے اس کے علاوہ باقی باتوں کے بھی شوقین ہوتے ہیں جیسے سوالات اور جوابات میں دلچسپی رکھنا، کہانیاں سننا اور سنانا وغیرہ وغیرہ۔

۵۔ بچے کو اظہار خیال کا موقع کم ملتا ہے جب کہ وہ کھیلنے میں ہر وقت مشغول رہتا ہے اور اپنا سارا قیمتی وقت کھیل کھیل میں ہی گزارتا ہے۔

۶۔ یہ طریقہ تعلیم بنیادی سطح پر اپنایا جاسکتا ہے۔ بنیادی سطح پر بچوں کے لیے بول

چال اور زبانی گفتگو ضروری ہے۔ جب کہ اس طریقہ تعلیم میں بچے کھیل کے ساتھ مصروف رہ کر بول چال اور گفت و شنید سے محروم رہ جاتے ہیں جو کہ ایک مبتدی کے لیے بہت ضروری ہے۔

۷۔ ہار جیت کا مسئلہ۔ ہارنے والا کم ہمت اور جیتنے والا بلند ہمت۔

۸۔ مختلف مضامین کا جوڑنا اس طریقہ تعلیم کے ذریعہ مشکل بنتا ہے۔

۹۔ اصلی اور جعلی سکھائی میں فرق پڑتا ہے۔

۱۰۔ نصاب اس طریقہ تعلیم کے مطابق تیار نہیں کیا جاتا ہے جس وجہ سے بچوں کو پڑھائی اور لکھائی میں وقت پیش آتی ہے۔

غرض کہ یہ طریقہ تعلیم جہاں تک بچوں کے لیے فائدہ مند ہے وہاں اس طریقہ تعلیم میں نقائص بھی ہیں۔ پھر بھی یہ طریقہ تعلیم مندرجہ ذیل طریقہ ہائے تعلیم کی بنیاد ہے اور ماہرانِ تعلیم اور تجربہ کار اساتذہ نے اس طریقہ تعلیم کو اپنانے کی سفارش کی ہے۔

(۱) کنڈرگارٹن (۲) مائٹی سوری طریقہ تعلیم (۳) پروجیکٹ میتھڈ (۴) ڈالٹن

پلین (۵) ہیورسٹک میتھڈ (۶) بنیادی تعلیم (۷) غیر از نصابی مشاغل۔

کھیل کھیل طریقہ تعلیم کا بانی کالڈ ویل کوک (Cald Well Cook)

ہے۔

ذو لسانی یا دو زبانی طریقہ تعلیم (Bi-lingual Method)

اس طریقہ تعلیم کے ذریعے بچوں کو دو زبانوں یعنی مادری زبان اور مقصودی زبان یعنی (جو زبان پڑھانے کا مقصد ہو یعنی اردو زبان) مقصدی زبان کو انگریزی زبان میں T.L بھی کہتے ہیں، تعلیم دی جاتی ہے۔ اس طریقہ کے ذریعے مادری زبان کے ذریعہ یا مادری زبان استعمال کر کے مقصدی زبان

پڑھائی اور سکھائی جاتی ہے اور مادری زبان میں مثالیں، اشارات اور توضیحات یا تدریسی اشیاء کے ذریعہ اردو زبان یعنی مقصدی زبان کا تصور دیا جاتا ہے۔ چونکہ بچہ پہلے سے ہی اپنی مادری زبان میں واقفیت رکھتا ہے اس لیے مدرس کو اس طریقہ تعلیم سے بچوں کو پڑھانا سکھانا اور سمجھانا آسان بن جاتا ہے۔ کیونکہ بچہ اپنی بنیادی واقفیت سے نئی زبان یعنی جو زبان سیکھنی مقصود ہو کے الفاظ اور ان کے معانی وغیرہ مدرس کی زبان سے سن کر یاد رکھتا ہے اور سیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طریقہ کار کی بنیاد دونوں زبانوں کی مشابہتوں اور تفاوتوں پر مبنی ہے۔ یہ مشابہتیں اور تفاوتیں دونوں زبانوں میں صورت حال اصوات، فرہنگ اور ساخت وغیرہ ہو سکتی ہے۔ جب طلبہ ان تفاوتوں اور مشابہتوں سے باخبر ہو جائیں تو وہ دوسری زبان سیکھنے کے اہل بن جائیں اور مشابہتوں سے ان کو دوسری زبان سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔ چونکہ ماہران تعلیم نے تعلیم کے پانچ ستون مقرر کئے ہیں (۱) معلم (۲) متعلم (۳) سرپرست یعنی والدین (۴) منتظمین (۵) ماحول۔

ماحول کا اثر بچوں پر پڑتا ہے خاص کر مبتدیوں کے لیے یعنی بنیادی سطح کے بچوں پر ماحول کا بہت اثر پڑتا ہے۔ بچہ آس پاس کی چیزوں کو دیکھتا ہے اور ایک ایک کر کے وہ پہلے ان کے نام یاد کرتا ہے۔ دولسانی طریقہ کار میں اس کے سامنے وہی ماحول یا صورت حال پیش کرتے ہیں جو اسے اپنی مادری زبان سیکھنے کے دوران ملا تھا۔ اس لیے مدرس یہ صورت حال مدنظر رکھتے ہوئے مقصدی زبان کو آسان بنانے کے لیے نئے الفاظ اور جملوں کے معانی دوسری زبان یعنی بچوں کی مادری زبان میں بچوں کو سمجھاتا ہے۔ اور بچوں کو بھی سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ مگر یہ بات صرف ابتدائی جماعتوں تک ہی محدود ہے۔ جب کہ اوپری کلاسوں میں راست طریقہ استعمال کیا جاتا ہے یعنی اردو زبان اردو میں ہی پڑھائی جاتی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ذولسانی طریقہ کار راست طریقہ کا متضاد ہے تو ٹھیک ہے۔ کیونکہ راست طریقہ میں کسی اور زبان کے استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے ذولسانی طریقہ کار ابتدائی سطح پر بچوں کو پڑھانے، سکھانے اور سمجھانے میں بہتر ثابت ہوگا۔ کیونکہ بچوں کا ذہن ابھی راست طریقہ سے سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کلاس میں ایسی صورت حال بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ استاد کی کوششوں کے باوجود بھی طلبہ کسی لفظ ترکیب یا جملے کے مفہوم سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس لیے مدرس اس طریقہ تعلیم کو اپنا کر بچوں کو سمجھانے کی کوشش کرے۔ اس طریقہ تعلیم میں پڑھانے کی افادیت بھی ہے اور نقصان بھی۔

افادیت یعنی محاسن یا خوبیاں مندرجہ ذیل ہیں۔

- ۱۔ مدرس کو پڑھانے میں آسانی پیش آتی ہے۔ بچے بھی مطمئن ہو جاتے ہیں۔ غرض کہ مدرس بچوں کو اُن کے اطمینان کے مطابق پڑھا سکتا ہے۔
- ۲۔ بچے نئی زبان یعنی مقصدی زبان آسانی کے ساتھ سمجھنے کے قابل بنتے ہیں۔
- ۳۔ یہ طریقہ تعلیم بچوں کے ماحول کے مطابق ہے۔
- ۴۔ اس طریقہ تعلیم سے بچوں میں بولنے، سننے، سمجھنے، پڑھنے اور لکھنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ غرض کہ بنیادی سطح پر جو تعلیمی مہارتیں ہیں وہ احسن طریقہ تعلیم سے پوری ہو جاتی ہیں۔

۵۔ اس طریقہ تعلیم سے بچے بالکل کم وقت میں مقصدی زبان یعنی نئی زبان سیکھنے اور سمجھنے کے اہل بن جاتے ہیں۔

۶۔ اس طریقہ تعلیم سے تدریسی اشیاء کا استعمال کم ہوتا ہے کیونکہ مدرس بچوں کو ان کی ہی مادری زبان میں مثالیں وغیرہ پیش کر کے اُن کو سمجھا سکتا ہے۔

۷۔ یہ طریقہ تعلیم وقت بچاؤ طریقہ تعلیم ہے۔ اس کے ذریعہ مدرس کم محنت کر کے

تھوڑے ہی وقت میں بچوں کو بخوبی پڑھا سکتا ہے اور بچے بھی کم وقت میں تفہیم سبق کر سکتے ہیں۔

۸۔ اس طریقہ تعلیم سے مدرس بچوں کو ہمدردی سے پڑھا سکتا ہے اور بچے بھی اس قابل ہوتے ہیں کہ مدرس ہمیں کیا پڑھاتا ہے اور تن و من سے تعلیم کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی بچوں میں دلچسپی بھی بڑھتی ہے اور یہ طریقہ تعلیم توجہ مرکوز طریقہ تعلیم ہے کیونکہ مدرس موقع و محل کے مطابق بچوں کو دوسری زبان میں پڑھانے کا مجاز ہے۔

۹۔ یہ طریقہ تعلیم نہ مدرس کے لیے ذہنی بوجھ بنتا ہے اور نہ طلباء کے لیے کیونکہ مدرس سابقہ واقفیت کے ذریعہ ہی بچوں کو پڑھانے کے قابل ہوتا ہے۔

۱۰۔ جو خوبیاں راست طریقہ میں موجود ہیں وہ سبھی خوبیاں ذولسانی طریقہ کار میں موجود ہیں۔

مندرجہ بالا محاسن مد نظر رکھتے ہوئے ذولسانی طریقہ تعلیم مبتدیوں کے لیے مفید اور سودمند طریقہ تعلیم ہے اور ابتدائی کلاسوں میں اپنانے کی اجازت ہے۔ اوپری کلاسوں میں اگر کوئی دوسری زبان مقصدی زبان سکھانے کے لیے مقرر کی جائے تو ان کلاسوں میں یہ طریقہ تعلیم اپنایا جاسکتا ہو۔

ذولسانی طریقہ تعلیم میں افادیت کے ساتھ ساتھ اس کی کچھ خامیاں یا نقائص بھی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اس طریقہ تعلیم سے بچوں کو پڑھاتے وقت یہ وقت پیش آتی ہے کہ اگر کلاس میں ایسے بچے بھی موجود ہوں گے جن کی مادری زبانیں مختلف ہیں یا مختلف مذاہب کے بچے ہوں گے یا بچوں کی مادری زبانوں میں علاقائی فرق ہو گا یا مختلف ماحول سے آئے ہوئے بچے موجود ہوں گے تو اس وقت مدرس کس

زبان کو دوسری زبان کے طور پر اختیار کرے گا۔ یا کس ماحول کی مثالیں پیش کرے گا۔ یہ صورت حال مد نظر رکھتے ہوئے یہ طریقہ تعلیم اپنانا مشکل بنے گا۔

۲۔ گاؤں میں پرائمری سطح پر یہ طریقہ کسی حد تک اپنانے کی گنجائش ہے مگر قصبوں اور شہروں کے سکولوں میں یہ طریقہ اپنانے میں مشکل آئے گی کیونکہ وہاں مختلف شہروں اور بیرونی ممالک سے آئے ہوئے بچے موجود ہوتے ہیں اس لیے یہ طریقہ تعلیم وہاں کے سکولوں خاص کر ہائی سکولوں، ہائر سیکنڈری سکولوں اور کالجوں میں اپنانے کی گنجائش نہیں ہے۔

۳۔ یہ بھی ایک مشکل ہے کہ اُستاد کو ایک ساتھ دونوں زبانوں پر پورا عبور حاصل ہو۔ مادری زبان کے بے جا استعمال کرنے سے مقصدی زبان (T.R) یعنی اردو بولنے میں ہمواری ٹھیک نہیں رہ سکتی ہے۔ کلاس میں دو زبانیں بولنے سے طلبہ میں ابہام یعنی کنفیوژن پیدا ہو سکتا ہے۔

۴۔ اس طریقہ تعلیم کے اپنانے سے اُستاد کے بارے میں بچوں کو بدظنی پیدا ہونے کا امکان ہے اُن کو کیا معلوم کہ اُستاد اُن کو کون سی زبان پڑھا رہا ہے۔

۵۔ چونکہ یہ طریقہ تعلیم ترجمہ کے ساتھ میل کھاتا ہے۔ حالانکہ دونوں طریقے مختلف ہیں۔ طریقہ ترجمہ کی خصوصیت اور اصول اور افادیت و نقائص الگ ہیں۔ جب کہ اس طریقہ تعلیم کے نقائص و افادیت الگ نہیں اس لیے ایسا ابہام بچوں میں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اُن کو کیا معلوم کہ مدرس ہمیں طریقہ ترجمہ سے سکھاتا ہے یا طریقہ ذولسانی سے۔

اس بحث سے یہ رائے ابھرتی ہے کہ پڑھانے کے مختلف اور بہت سے طریقے ہیں۔ کلاس میں مدرس صورت حال کے پیش نظر اپنے تجربہ کے مطابق طریقہ تعلیم اپنائے اور بچوں کو علم کے نور سے منور کرے۔

ساختی طرز یا بناوٹی طرز

(Structural Approach)

ساختی طرز کوئی طریقہ نہیں بلکہ یہ ایک طرز نظر ہے۔ چونکہ طریقہ کار مختلف ٹیکنیکوں سے بنتا ہے اور ایک مضمون سے دوسرے مضمون تک یا ایک شخص سے دوسرے شخص تک مختلف ہوتا ہے۔ طرز نظر میں مختلف ساختوں کو عمل میں لا کر ایک اہم چیز حاصل کر لیتے ہیں۔ کوئی بھی طریقہ سامنے رکھ کر ساختی طرز تعلیم کے ذریعے طلبہ کو زبان پڑھائی اور سکھائی جاتی ہے۔

ساختی طرز نظر کے ذریعے زبان سکھانے کے عمل کو تیز کر سکتے ہیں۔ چونکہ (Structural Approach) دو لفظوں کا مرکب ہے۔ سٹرکچر اور اپروچ۔ سٹرکچر کے معنی ساخت یا بناوٹ اور اپروچ کے معنی ہے نزدیک آنا۔ اس طرح اس طرز نظر کے تحت ہم بچوں کو زبان پڑھانے کے قابل بنا سکتے ہیں۔ اس طرز نظر کے ذریعے بنیادی کلاسوں میں پہلے حروف کی پہچان اور حروف کو ملا کر الفاظ کی ساخت، بعد میں یہ الفاظ آپس میں ملا کر جملے تیار کئے جاتے ہیں۔ جملوں کی ساخت سے عبارت تیار کی جاتی ہے۔ جس سے پڑھنا سیکھنا بہت ہی مؤثر بن جاتا ہے۔ چونکہ ابتداء جملاتی طریقہ سے کی جاتی ہے۔ جب طلبہ کئی جملے پڑھنے کے قابل بنتے ہیں تو انہیں الفاظ کی شناخت اور معانی بھی سکھائے جاتے ہیں۔ اس سے بنیادی سطح پر بچوں کے ذہن کی نشوونما ہو جاتی ہے اور زبان سیکھنے کے قابل بن جاتے

ہیں۔ مگر جملے تصوری ہوں۔ کیونکہ پانچ چھ سال کے بچوں کے خیالات تصور پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس لیے بچوں کا ذہن اس ساختی طرز سے متحرک کیا جائے۔ جملوں کے حاصل کرنے کا خاص منبع بچوں کا بول چال ہے اور ان کا متحرک ذہن۔ مگر جملے ایسے ہوں جو عام طور ان کے بول چال کے لیے مدد ثابت ہوں چونکہ یہ قانون فطرت کے عین مطابق ہے کہ بچہ شروع سے ہی جملوں کی ساخت سے کام لیتا ہے اور جملے بولنا پسند کرتا ہے۔ جملے کہنے سے اس کی رفتار گفتار میں تیزی آ جاتی ہے۔ اس طرز سے پڑھاتے وقت مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ فقرات چھوٹے چھوٹے ہوں۔

۲۔ فقرات روزمرہ کام آنے والے چیزوں پر ہوں۔

۳۔ لکھنے اور بولنے میں پیچیدہ نہ ہوں۔

۴۔ ارد گرد کی ضروریات اور ماحول کے مطابق ہوں۔

۵۔ الفاظ آسان ہوں اور سمجھ کے قابل ہوں۔

جملوں کی ساختوں کی بنیادوں پر کسی زبان تک رسائی حاصل کر لینے کو ساختی طرز نظر بنتا ہے۔ اس طرز میں زیادہ زور محاوروں اور جملوں پر دیا جاتا ہے اور مقصدی زبان پر قابو پاتے ہیں۔ عام طور ساختی طرز نظر ابتدائی سطح اور وسطانوی سطح پر عملایا جاتا ہے کیونکہ عام طور مڈل کلاسوں کے اردو نصاب میں درسی کتابیں اس طرز پر تیار کی جاتی ہیں جب کہ مضمون کے آخر پر ایسے سوالات ہوتے ہیں جن میں اشارات، تصاویر اور الفاظ کے آپس میں جوڑنے اور ملانے سے بچوں کا ذہنی معیار بھی ماپا جاسکتا ہے اور ساختی طرز نظر کے مطابق جملے کی ساخت یا بناوٹ عمل میں لائی جاتی ہے۔ اس طرح زبان کی بنیادی مہارتیں یعنی بولنا، پڑھنا، لکھنا اور سمجھنا اس طرز نظر سے پورے کئے جاسکتے ہیں۔ ڈرل کرانے اور بار بار دہرانے

- سے زبان سکھائی جاتی ہے۔ اس طرز نظر کے خاص خاص اصول مندرجہ ذیل ہیں:
- ۱۔ بولنے کی اہمیت: بچہ اس طرز نظر کے تحت بولنا سیکھتا ہے گویا کہ اس طرز نظر میں بولنا خاص اہمیت کا حامل ہے۔ بولنے کے بغیر یہ طرز نظر نام کام رہتا ہے۔
 - ۲۔ بچے فعال بنتے ہیں یعنی وہ ایکٹیو رہتے ہیں: اس اصول کے تحت دونوں استاد اور بچہ مرکز تربیت بنتے ہیں یعنی مدرس بھی کام میں رہتا ہے اور طلبہ بھی اور تعلیم طفل مرکوز رہتی ہے۔ کیونکہ دونوں کا آپس میں ربط اور تعلق رہتا ہے اور معنی خیز مواقع پیدا ہوتے ہیں۔

۳۔ مواقع کا فائدہ اٹھانا: اس اصول کے تحت استاد موقع کا فائدہ اٹھا کر بچوں کو ساختی طرز کے تحت اچھی طرح پڑھا سکتا ہے اور مواقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا ہے۔ اس طرح بچوں کو بھی موقع کا فائدہ ملتا ہے۔ جس سے بچے جلدی طور سبق سمجھ سکتے ہیں اور وقت بھی کم صرف ہوتا ہے۔

ساختی طرز نظر کے فائدے یا محاسن (Advantages)

ساختی طرز کی افادیت مندرجہ ذیل ہے:

- ۱۔ اس طرز نظر سے بچوں کو غور و فکر کرنے کا موقع ملتا ہے اور جملے بنانے کے قابل بنتے ہیں۔
- ۲۔ اس طرز نظر میں پڑھنے اور لکھنے سے قبل بولنے اور سمجھنے پر ترجیح دی جاتی ہے۔
- ۳۔ اس طرز نظر سے بچے زبان پر اچھا خاصا عبور رکھنے کے اہل بنتے ہیں۔
- ۴۔ اس طرز نظر سے تلفظ میں تصحیح ہو سکتی ہے۔
- ۵۔ اس طرز نظر سے پست ذہن بچے بھی جلدی سے زبان سیکھنے کے اہل بنتے ہیں۔
- ۶۔ اس طرز نظر سے طلبہ ہمیشہ فعال رہتے ہیں۔

۷۔ اس طرز نظر سے طلبہ زبان کی فصاحت سیکھنے کے اہل بنتے ہیں۔
جہاں اس طرز نظر کے فوائد ہیں یہ خامیوں سے بھی مُبرا نہیں۔

حسامیاں (Disadvantages)

۱۔ اس طرز نظر کو اپنانے کے لیے محنتی اساتذہ کی ضرورت ہے۔ جب کہ محنتی اور تجربہ کار اساتذہ کی کمی کی وجہ سے بچوں تک صحیح طور تعلیم نہیں پہنچتی ہے۔
۲۔ یہ طرز نظر تب ہی کامیاب رہے گا جب نصاب اس طرز نظر کے طریقہ پر تیار کیا جائے گا۔

۳۔ اس طرز نظر میں بچوں کو کافی عمل کرنا پڑتا ہے جس سے پڑھنے اور پڑھانے میں وقت بھی لگتا ہے اور محنت سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔

۴۔ اس بات کی اجازت نہیں کہ ساختوں کا ترجمہ کیا جائے۔ طلبہ کو صرف ساختوں کی مشق کرنی ہوتی ہے جس وجہ سے افہام میں دقت پیش آتی ہے۔

اردو زبان سیکھنے والے بچوں کے لیے یہ طریقہ نہایت موزون اور مناسب ہے کیونکہ بچوں کی نفسیاتی طریقہ کے مطابق یہ طرز نظر سیکھنے سکھانے کے لیے بہت مددگار ثابت ہو چکا ہے۔ چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں جن سے بچوں کو یہ طرز نظر سمجھنے اور اپنانے میں مدد ملے گی۔ کیونکہ وسطانوی درجوں کی درسی کتب ابوں کے عنوانات کے خاتمہ پر بھی اس قسم کا طرز نظر یہ پیش کیا گیا ہے جس سے بچوں کو جملاتی طرز کا طریقہ سیکھنے میں مدد ملتی ہے۔

استاد کو چاہیے کہ وہ کلاس میں با معنی صورت حال پیدا کر کے یہ طرز نظر اپنائے اور بچوں کو زبان تک پہنچانے کی کوشش کرے۔

مثلاً: مدرس کتاب ہاتھ میں لے کر بچوں سے چھوٹے چھوٹے، آسان اور با معنی جملے بنا کر بچوں کے ساتھ اس طرح گفت و شنید کرے اور تختہ سیاہ پر ایک

ڈبہ جیسا خاکہ بنا کر جملوں کی ساخت یا بناوٹ تیار کر کے بچوں کو جملوں کے ذریعہ جملے بنانا اور تذکیر و تانیث، واحد جمع یعنی کہ گرامر کا تصور بھی بچوں میں پیدا کرے۔

خاکہ اس طرح ہے:

یہ	ہے	میرا	قلم
وہ	تمہاری	کتاب	ہے
اس کا	نام	احمد	ہے
اس کا	نام	حمید	نہیں ہے

جملہ نمبر (i) وہ تمہاری کتاب ہے

(ii) وہ میرا قلم ہے

(iii) یہ تمہاری قلم ہے

(تیسرا جملہ تذکیر و تانیث کے حساب سے غلط ہوا)

اگر ہم لکھیں گے یہ ہے میرا قلم۔ جملے کی فصاحت اچھی نہیں رہی۔

جب کہ جملے کی فصاحت اس طرح ہے: یہ میرا قلم ہے۔

اس طرح مدرس بچوں کو جملوں کی ساخت کے وقت گرامر بھی سکھا سکتا ہے

اور جملوں کی ساخت بھی۔ ساتھ ہی زبان کی سجاوٹ اور خوبصورتی سے بھی بچوں کو اس طرز نظر سے روشناس کرا سکتا ہے۔

ترسیلی یا ابلاغی طرزِ نظر

(Communication Approach)

کیونٹیشن اپروچ انگریزی دلفظوں کا ایک مرکب لفظ ہے جس کے معنی ہے ترسیلی طرز یا ابلاغی طرز ترسیل یا ابلاغ کے معنی ہیں بات کسی تک پہنچانا۔ اس میں متکلم اور مخاطب کا آپس میں گہر اعلق ہے متکلم بات صاف صاف اور بلا واسطہ مخاطب تک پہنچائے۔ بات کرنے والا اور سننے والا دونوں بات صحیح طور بیان کر کے بات بیان کرنے والا بات سننے والے تک فصاحت و بلاغت اور شستہ طور پہنچائے۔ چونکہ درس و تدریس میں اُستاد اور شاگرد کا آپس میں گہر اعلق ہے۔ اُستاد اپنی بات صحیح طور اپنے شاگرد تک اس طرح پہنچائے تاکہ اس کا مطلب اور مفہوم شاگرد کے ذہن اور دل و دماغ تک صحیح طور پہنچے۔ آپس میں گفت و شنید اور بول چال کا نام ہی ترسیلی طرز ہے۔ چونکہ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے بلکہ زبان شاگرد تک پہنچانا اور بات کا ترسیل کرنے کا نام ابلاغی طرزِ نظر ہے۔ چونکہ زبان کا سیکھنا انسانی زندگی کا ایک اہم مقصد ہے۔ اس لیے یہ مقصد پورا کرنے کے لیے ترسیلی طرز اہم رول ہے۔ اگر ترسیل میں کچھ خامی ہو تو زبان تک رسائی حاصل ہونے میں بھی خامی رہے گی اس لیے مدرس کو چاہیے کہ وہ اس طرزِ نظر سے کام لے کر اپنے شاگردوں کو زبان بولنا سکھائے۔ اس طرزِ نظر کے ذریعہ اُستاد اپنے دل کے خیالات اپنے شاگردوں تک پہنچائے۔ بشرطیکہ اُستاد کی زبان صحیح ہو اور اس کو زبان دانی پر پورا پورا عبور حاصل ہو۔ اُستاد زبان کے قواعد، رموز و اوقاف اور باقی

اصناف ادب و اصناف سخن پر پوری قدرت حاصل ہو تب ہی وہ اس زبان کو اپنے طلبہ تک پہنچانے کے قابل ہو سکتا ہے۔ نیز ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم زبان کی ساختوں یا بناوٹوں اور فرہنگ وغیرہ سے واقف ہوں۔ زبان پڑھنا اور لکھنا اُستاد جانتا ہو تب ہی اس کی گفتگو اور بول چال شاگردوں کو متاثر کرے گی۔

چونکہ ابتدائی درجوں میں کتاب یکسو ڈال کر بچے کی صحیح تعلیم و تربیت دراصل بات چیت ہی سے شروع ہوتی ہے۔ یہ بات چیت روزانہ زندگی کی ضروریات اور اُن چیزوں سے متعلق ہونا چاہیے جن کا یا تو بچوں نے خود مشاہدہ کیا ہو یا جو اُن کے مشاہدے میں لائی جاسکتی ہوں۔ بات چیت کا سلسلہ ایک باقاعدہ منصوبہ کے تحت جاری رہنا چاہیے۔ تاکہ انہیں ایک نظم و ضبط کے ساتھ ہر قسم کی ابتدائی اور معتمی واقفیت مل جائے۔ مثلاً بچوں کو عام اشیاء اور ضرورت کے متعلق واقفیت دینے کے بعد انسانی اعضاء، دنوں، مہینوں کے نام بتائے جائیں۔ مروجہ سکوں کی پہچان کرائی جائے۔ مقامی آب و ہوا اور موسموں کے بارے میں انہیں واقفیت بہم پہنچائی جائے۔ مقامی جغرافیہ اور تاریخ کی ابتدائی باتیں بتائی جائیں۔ مختلف اشیاء کے فائدوں، پیشوں اور پیشہ وروں کی اہمیت کا ذکر کیا جائے۔ چونکہ یہ ایک نفسیاتی اصول ہے کہ بچے سے نچلا نہیں بیٹھا جاسکتا وہ کچھ نہ کچھ کرنا یا کہنا چاہتا ہے۔ دور جدید کا اُستاد بچے کی فطرت کا مطالعہ کر کے سکول میں اس کے لیے حسب مراد ماحول تشکیل دیتا ہے اور بچوں کے دل میں شوق اور ولولہ مشاہدہ اور دلچسپ بات چیت سے پیدا کیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی درجوں کے لیے گفتگو اور بات چیت کا خاکہ ذیل میں دیا جاتا ہے:

مقامی حالات، کلاس روم صورت حال اور بچوں کے ذہنی معیار کے مطابق اس میں ترمیم اور تبدیلی کی جاسکتی ہے۔

۱۔ جسم: جسم کے حصے، ان کے فائدے، لباس، صوفی اور اُونی کپڑے اور ان کو

پہننے کا موسم۔

- ۲۔ کھانا: اناج، روزمرہ کھانے پینے کی چیزیں۔
نوٹ: (اناج اور دوسری کھانے پینے کی چیزوں کے نمونوں کا مشاہدہ کرایا جائے)
پانی، بارش، برف، سردی، گرمی، اولے، کھر وغیرہ۔
- ۳۔ رشتہ داروں کی ترسیل جیسے ماں، باپ، بھائی، بہن، دادا، دادی، نانا، نانی اور دوسرے رشتہ دار وغیرہ۔
- ۴۔ مکان: کھانا پکانے کا کمرہ، سونے کا کمرہ، کھانے پینے کے برتن، بچھونا وغیرہ۔
- ۵۔ سکول کی جانکاری: سکول کی عمارت، کمرے اور سکول میں موجودہ اشیاء وغیرہ۔
- ۶۔ گھر کی جانکاری: گھر کا ماحول اور سکول کے ماحول کا تقابل کرایا جائے۔
- ۷۔ پالتو جانوروں اور جنگلی جانوروں کے بارے میں بات چیت کے ذریعے معلومات پہنچائے جائیں۔
- ۸۔ مختلف میوؤں وغیرہ کی ترسیل کی جائے تاکہ بچے مکمل طور واقف ہو جائیں۔
- ۹۔ ہفتے کے دنوں کے نام اور سال کے مہینوں کے نام اور ان کا شمار بچوں تک پہنچایا جائے۔
- ۱۰۔ ماحول کے بارے میں ترسیلی طرز اختیار کر کے ہمایوں، دکانداروں اور باقی مختلف جانداروں اور بے جان چیزوں کے بارے میں واقفیت دلائی جائے۔
اوپر کے عنوانات پر مفصل گفتگو یعنی ابلاغی طرز اختیار کر کے مدرس ابتدائی سطح کے بچوں کو جواب دینا اور درست زبان بولنا سکھائے۔
ثانوی سطح پر مدرس بچوں کو نئے نئے معلومات، سائنسی ایجادات، ملکی اور غیر ملکی خبریں اور روزمرہ رونما ہونے والے واقعات، جدید ٹیکنالوجی کے معلومات، اخبارات، رسالے اور میگزین وغیرہ کے بارے میں مکمل ترسیل کرے۔ تاکہ طلبہ

حالات جدید کے بارے میں تفصیل سے جانکاری حاصل کریں۔ ایسا صرف تب ہی ہو سکتا ہے۔ جب اُستاد اور شاگرد زبان پر مکمل عبور رکھتے ہوں اور تب ہی ترسیل بھی دُرست رہے گی۔

چونکہ زمانہ جدید میں ترسیلی ذرائع بے شمار ہیں جن میں ریڈیو، ٹیلی ویژن، فون، میڈیا، طباعت، اخبارات، انٹرنیٹ، کمپیوٹر وغیرہ وغیرہ جن سے ابلاغی طرز پر بچوں کو کافی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ ایسا تب ہی ہو سکتا ہے جب طلبہ یہ تمام سمجھنے کے قابل ہوں اور ان کی ترسیل طلبہ تک صحیح طور آ سکے۔

مندرجہ بالا ذرائع ابلاغ مد نظر رکھتے ہوئے ابلاغی طرز کی اپنی افادیت ہے۔ جس کا ذکر مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ اچھی ترسیل سے خیالات اور احساسات دوسروں تک یعنی سامعین تک بڑی خوش اسلوبی اور اعتماد کے ساتھ پہنچ سکتی ہے۔

۲۔ سامعین اچھی ترسیل سے یکدم متاثر ہو جاتے ہیں۔

۳۔ ترسیلی طرز کے ذریعہ گفتگو کے پوری قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور بچوں کو گفتگو سے مکالمہ، مکالمہ سے تقریر اور تقریر سے بحث اور قصہ گوئی کی طرف لایا جاسکتا ہے۔

۴۔ فرہنگ کی جانکاری، زبان کی ساختوں سے واقفیت اور گرامر کی واقفیت بڑھ جاتی ہے۔

۵۔ فصاحت و بلاغت، زبان کے صحیح استعمال، ادب کی جانکاری اور دیگر معلومات سے طرز ترسیل اپنانے سے طلبہ روشناس ہو جاتے ہیں۔

افادیت کے ساتھ ساتھ کچھ خامیاں بھی ہیں: وہ اس طرح ہیں:

۱۔ ترسیل کو تب بروئے کار لایا جاتا ہے جب دونوں فریقین یعنی کلام کرنے والا

اور سامع ایک دوسرے سے فاصلے پر ہوں۔ گو کہ ترسیل تب ہی ہوگی جب طلبہ کے لیے ضروری سامان، تدریسی اشیاء میسر ہوں۔ اگر ان میں ذرا بھر کمی ہو تو ترسیل میں بھی خامی رہے گی۔

۲۔ مدرس کو زبان پر مکمل عبور ہو اور ماہر لسانیات ہو، ادب جانتا ہو، قواعد زبان سے واقف ہو تب ہی ترسیلی طرز اچھا اور معنی خیز رہے گا۔ ورنہ طلبہ تک اچھی طرح زبان نہ پہنچنے کا امکان ہے۔

۳۔ زمانہ جدید میں ذرائع ابلاغ بہت ہیں جن کا میسر ہونا وقت پر ناممکن بنتا ہے۔ مثلاً آج کل کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا زمانہ ہے مگر ہر طالب علم اس سے مستفید نہیں ہو سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یا تو یہ چیزیں قوت خرید سے باہر ہیں یا ان کا میسر ہونا مشکل بن جاتا ہے۔ جس سے طلبہ میں ترسیلی طرز سے تعلیم حاصل کرنے میں رکاوٹ آتی ہے اور ترسیلی طرز نام کام رہ جاتا ہے۔

۴۔ جدید ٹیکنالوجی ترسیلی طرز سے سکھائی جاتی ہے اور اس میں زبان کا اہم رول ہے۔ اگر زبان دانی میں کچھ کمی ہو تو ترسیلی طرز نام کام ہو جاتا ہے۔

مندرجہ بالا محاسن و نقائص کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگر ہم پوری واقفیت، جانکاری، تجربہ کاری اور علم و دانش سے بچوں کو علم و ادب کی طرف راغب کر کے اُن کو زبان دانی کی مکمل تربیت دیں تو یہ آج کا بچہ کل کا شہری صحیح معنوں میں انسان بنے گا۔ بقول حالی ۔

فرشتوں سے بہتر ہے انسان بننا
مگر لگتی ہے اس میں محنت زیادہ

منتخب طرزِ نظر یا مخطوط طریقہ تعلیم

(Electric Approach)

ماہرین پڑھانے کا اب ایک نیا طریقہ بتاتے ہیں۔ جس کا نام انہوں نے منتخب طرزِ نظر یا مخطوط طریقہ رکھا ہے۔ یہ طریقہ سب طریقوں کے مقابلے میں بہترین طریقہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مخطوط طریقہ تمام طریقوں کے اچھے اچھے حصوں کا ایک مجموعہ ہے۔ کئی تعلیمی ماہروں کا خیال ہے کہ دنیا میں جتنے اُستاد ہیں پڑھانے کے طریقے بھی اتنے ہی ہیں۔ اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ہر مدرس کا اپنا ایک آزما یا اور جانچا ہوا طریقہ ہوتا ہے۔ جسے وہ اپنے انداز میں برت کر اچھے نتائج پیدا کر لیتا ہے۔ اس قول کو تسلیم کرنے لینے کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ ہر طریقے کے پیچھے کوئی نہ کوئی خوبی کارفرما ہوتی ہے۔ جس کے پیشِ نظر ہمیں اُن خوبیوں کو جانچنا چاہیے۔ اور ان کا چھوڑ کر کے ایک نئے طریقے کی بنیاد پڑی اس نئے طریقے کا نام مخطوط طریقہ رکھا گیا کیونکہ باقی طریقوں کا مرکب ہوتا ہے۔

اصل میں تعلیمی طریقے کسی ملک کے نظامِ تعلیم اور اُس دور کے تعلیمی اور سماجی تقاضوں کی نشاندہی کرتے ہیں جس میں وہ معرضِ وجود میں آئے ہوں۔ اسی طرح سے اور کسی جماعت یا قوم کا تعلیمی نظام بھی اُسی تہذیب و تمدن اور اُن اُمّتوں کا

آئینہ دار ہوتا ہے جنہیں اُس نے اپنے حال اور مستقبل کی بہتری اور برتری کا ضامن بنالیا ہو۔ آج اگر ہم خوب سے خوب تر طریقوں کی تلاش میں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے ملک کے بدلے ہوئے حالات، انفرادی اور قومی زندگی کے عظیم مقاصد اور اپنے سیاسی، سماجی اور اقتصادی پروگرام کے عین مطابق ایسا تعلیمی ڈھانچہ تیار کرنے کے درپے ہیں جو ہمارے تعلیمی مستقبل کو درخشاں بنادے۔ لیکن اس کے ساتھ ہم پرانے طریقوں کی خوبیاں بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ تجربہ سے پایا گیا ہے کہ پرانے طریقوں کے اچھے اچھے حصوں کو ملا کر استعمال کرنے سے اچھے نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ مخلوط طریقے میں مختلف طریقوں کے ان ہی اچھے اچھے حصوں کو سمو یا گیا ہے۔

مخلوط طریقہ کی بنیاد جمہلاتی طریقہ پر رکھی گئی ہے اور جمہلاتی طریقہ کی بنیاد طریقہ ”دیکھو بولو“، ”ببین و بخواں“ پر رکھی گئی ہے۔ مشاغل اور کھیل کھیل کی وہ ساری باتیں جو جمہلاتی طریقہ یا طریقہ ”دیکھو بولو“ میں موجود ہیں (طریقہ ”دیکھو بولو“ کو انگریزی میں Look & Say Method کہتے ہیں)۔ مخلوط طریقہ تعلیم میں منتقل کی گئی ہیں۔ البتہ اس طریقے میں استاد کو ابتداء میں ہی مرکبات اور الفاظ کے تجزیہ اور تحلیل اور لفظ شناسی کی طرف زیادہ توجہ دینا پڑتی ہے۔ اس طرح لفظ اور حروف کے سیکھنے کا کام ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے۔ لفظ شناسی کے ساتھ جب بچوں کی حروف شناسی کی پوری مشق ملتی ہے۔ تو وہ اپنی سابقہ واقفیت کی بنیاد پر نئے حروف اور الفاظ پہچانتے ہیں۔ اس طریقے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُستاد موقع اور محل، بچوں کی عمر اور ذہنی استعداد کے مطابق کسی بھی طریقے کا کوئی بہترین حصہ آزادی اور دانشمندی کے ساتھ شامل کر کے استعمال کر سکتا ہے۔ مخلوط طریقہ اپنی لچک اور دوسری مفید خصوصیات کی بناء پر اُستاد اور بچوں کے لیے اعلیٰ

مفاد کا حامل ہے۔ اس طریقے سے بہترین نتائج حاصل کرنے کے لیے اسنادِ زبان کا ذیل کی ہدایت پر سختی کے ساتھ عمل کرنا بہت ضروری ہے۔

۱۔ آسان الفاظ ”دیکھو بولو“ (Look and Say) کے طریقے سے سکھائے جائیں۔

۲۔ حروفِ صحیح کی آوازیں صوتی طریقے سے سکھائی جائیں۔

۳۔ بدورانِ سبق ”دیکھو بولو“ (Look and Say) کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بچوں کی زبان میں روانی پیدا کی جائے۔

۴۔ خاص خاص اور نئے الفاظ درج بورڈ کئے جائیں اور ترکیبی طریقے کے تحت اُن کی تحلیل کرائی جائے۔

۵۔ حروفِ تہجی ابجدی طریقے سے سکھائے جائیں، ایسا کرتے ہوئے جدید نفسیاتی طریقوں سے بھی کام لیا جائے۔

۶۔ عبارت خوانی کے لیے ”طریقہ دیکھو بولو“ سے کام لیا جائے اور جہاں کوئی مشکل درپیش آئے تو طریقہ تہجی استعمال کیا جائے۔

مندرجہ بالا ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ایک اچھا اُستاد اُن ہدایات کے علاوہ اس طریقے میں کوئی اور مناسب کمی بیشی کرنے کا بھی مجاز ہے۔ تاکہ بچوں میں تعلیمی بہتری آجائے اور ان کی تعلیمی دلچسپیاں شد و مد سے بڑھتی جائیں تاکہ ان کی زندگی تابناک اور کامیاب بن جائے اور قوم کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو جائیں۔

اُستاد کی حکمتِ عملی کے مطابق یہ طریقہ تعلیم بنیادی سطح پر زیادہ موزون اور بر محل رہتا ہے۔ اگر اُستاد ثانوی سطح پر اس طریقہ تعلیم کو اپنائے تو بہتر رہتا ہے۔ کیونکہ یہ پہلے ہی بتایا گیا کہ جتنے اُستاد اتنے پڑھانے کے طریقے۔ اس طرح ثانوی سطح پر اُستاد باقی طریقوں کی خوبیاں اپنا کر کلاس روم میں کلاس کی

صورت حال کے مطابق اس نئے طریقہ یعنی مخلوط طریقہ سے کام نبھائے۔ ایک اچھے معلم کی یہ خوبی بھی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی خاص نظریے یا طریقے کا غلام نہ بنائیں۔ اس لیے اُستاد کو چاہیے کہ وہ حکمتِ عملی اور عقلِ سلیم سے کام لے کر اپنے لیے ایک ایسا راستہ اختیار کر لے جس سے وہ طلبہ کو بڑی آسانی کے ساتھ مطمئن کر سکے اور طلبہ بھی علم کا فیض حاصل کر سکیں۔

کوشش بھی کر، اُمید بھی رکھ راستہ بھی چُن

پھر اس کے بعد تھوڑا مقدار تلاش کر

چند مشہور اساتذہ کے مخلوط طریقے کی مثالیں:

ان مثالوں کو دیکھنے اور اپنانے سے معلوم ہوگا کہ مدرس کے لیے طریقے کے

انتخاب کی کتنی گنجائش ہے۔

مَس ایٹونس کا طریقہ: مَس ایٹونس امریکہ کی بڑی مشہور معلمہ ہیں۔

جنہوں نے قصہ واری طریقے کی بڑی حمایت کی ہے۔ لیکن درحقیقت ان کا طریقہ

مخلوط طریقہ ہے۔ جس کی ابتداء قصے سے ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ قصہ داری طریقے کی

پابند نہیں بلکہ بقدر ضرورت اس طریقہ سے کام لیتی ہے اور کامیابی حاصل کرتی

ہیں۔ اپنے طریقے کے متعلق مَس ایٹونس کہتی ہے کہ ”میں ایک کامیاب اور خوشگوار

طریقے سے بچوں کو پڑھنا سکھاتی ہوں یہ وہ طریقہ ہے جو میرے نزدیک ان کی

قدرتی نشوونما کے مطابق ہوتا ہے۔“ اُس نے اس طریقہ تعلیم کی ابتداء ایک نظم سے

کی ہے جو بڑے بڑے تختوں پر جلی حروف میں چھاپی گئی۔ بچوں سے کہا گیا کہ

اس نظم کے خاص خاص لفظوں کی شناخت کریں۔ اور بعض الفاظ کو کرہ جماعت کی

اشیاء سے ربط دیتے ہیں اور آسان الفاظ بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ بعد روزمرہ

ان کی مشق کروائی جاتی ہے۔ اس غرض کے لیے مختلف تدابیر سے کام لیا جاتا ہے۔

مثلاً کارڈ، حرفوں کے ڈبے اور کھیل وغیرہ اور صوتی طریقہ، لفظوں کو توڑنا اور جوڑنا، قافیہ بندی کرنا نئے الفاظ کو ڈھونڈنا اور ان کو جملوں میں استعمال کرنا ہوتا ہے۔

سجاد مرزا کا مخلوط طریقہ

اردو پڑھانے کے لیے ابجدی اور صوتی طریقہ اور بعض جگہ جملائی طریقہ تجویز کئے گئے ہیں۔ چنانچہ پرنسپل سجاد مرزا نے جو طریقہ تجویز کیا ہے اس میں کئی طریقوں کے بہترین اصول لئے گئے ہیں۔

(۱) ان میں دیکھو اور بولو کا طریقہ (۲) صوتی طریقہ (۳) ترکیبی طریقہ (۴) لفظ سازی یا ساختی طریقہ۔ ان طریقوں کے موٹے موٹے اصول لئے گئے ہیں جن کا بیان پہلے ہی کیا گیا۔

سجاد مرزا کا کہنا ہے کہ ان طریقوں سے جب اردو پڑھائی جائے تو بچے بہت جلد پڑھنا سیکھ لیتے ہیں۔



UNIT III

Reading and Writing

یونٹ (۳) ریڈنگ-اینڈ رائٹنگ

تیسرا حصہ-تیسری اکائی

”لکھائی اور پڑھائی“

چمن میں تربیت غنچہ ہو نہیں سکتی
 نہیں جو قطرہ شبنم اگر شریکِ نسیم
 علامہ اقبالؒ
 (ماخوذ از ضربِ کلیم)

G.M. College of Education
 Raipur, Bantalab
 Jammu.

Acc. No... 10767

Dated ... 30-1-2015

پڑھنا (Reading)

پڑھنا علم حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ مختلف علوم اور متعدد مضامین تک ہماری رسائی پڑھنے ہی سے ہوتی ہے۔ پڑھنا ایک ایسا عمل ہے جس سے بچے زیور نطق سے آراستہ ہو جاتے ہیں اور جس سے ان کی تمام ذہنی قوتوں کی تربیت ہوتی ہے۔ پڑھنا ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے طفیل کوئی انسان اپنے ملک کے علم، فن، آرٹ اور ادب کے علاوہ دوسرے ممالک کے علوم و فنون سے واقف ہو جاتا ہے۔ اپنے ماضی کا مطالعہ کر کے حال کا جائزہ لے کر اُسے سنوارتا ہے اور مستقبل کے بارے میں ترقی کے منصوبے سوچتا اور روبہ عمل لاتا ہے۔ گھر بیٹھے دنیا بھر کی سیر کرتا ہے۔ اپنے علم و فضل کے دائرے کو وسیع اپنے خیالات کو اعلیٰ اور لطیف اور فکر و نظر کو بلند بنا کر سمجھنے کے قابل بن جاتا ہے۔ پڑھنے سے ہی ہم ہر چیز اور ہر قسم کا علم حاصل کر سکتے ہیں۔ اور یہی علم ہمارے سامنے عمل کی راہیں بھی کھول دیتا ہے اور عمل ہی دراصل وہ کامیاب وسیلہ ہے جو خازنِ زندگی کو جنتِ نظیرِ گلشنِ بنا دیتا ہے۔ چنانچہ شاعر مشرق فرماتے ہیں ۔

عمل سے زندگی بسنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

یہ خاکِ اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

پڑھنے سے قاری علم حاصل کرنے کے علاوہ اپنے اندر خودداری کا ایک

اندازہ احساس پالیتا ہے۔ اس کی نظر میں گہرائی اور اردوں میں بلندی آ جاتی ہے۔

پس جب پڑھنا سیکھنا حاصل ہوں تو استاد پر کیا یہ لازم

نہیں آتا کہ وہ بہترین تعلیمی اور نفسیاتی طریقوں کی روشنی میں بچوں کو پڑھنا سکھائے اور ان میں پڑھنے اور مطالعہ کرنے کا وہ پاکیزہ اور شستہ مذاق پیدا کرے جو انہیں سکولی زندگی کے بعد بھی زندگی کے اس لطف اور مفید مشغل سے الگ نہ ہونے دے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قسم کے مطالعہ کا درست مذاق ان میں نچلے درجوں ہی میں پیدا کیا جاسکتا ہے۔ جس کی پائیدار بنیاد پروہ مدرے میں کامیاب طالب علم اور بعد کی عملی زندگی میں مطالعہ کے شائق علم دوست اور باعمل شہری بن سکتے ہیں۔

اس لیے ہر استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ بچوں کو پڑھنے خاص کر خوش خوانی کے اصول کی روشنی میں پڑھنے کے قابل بنانے کے لیے ان کی آنکھ، دماغ اور گلے کا آپس میں ہم آہنگ ہو کر ایک قدرتی ربط و نظم کے ساتھ کام کرنا سکھائے۔ ذیل میں ان تینوں کے کام الگ الگ دکھائے جاتے ہیں:

(۱) آنکھ کا کام دیکھنا اور پہچاننا (ب) دماغ کا کام باضمرہ اور حافظہ کی مدد سے سمجھنا یا ادراک کرنا اور تصویر کشی کرنا (ج) گلے کا کام دماغ پر کھینچی ہوئی تصویر کے نام کو خاموشی کے ساتھ یا اونچی آواز میں بیان کرنا۔

خوش خوانی

اصول خوش خوانی کے تحت بچوں کو زبان پڑھانے سے ان میں اس مضمون کی اعلیٰ قابلیت اور قرأت کے جملہ اوصاف پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ خوش خوانی کے اصول یہ ہیں:

(۱) تلفظ: یعنی حروف اور الفاظ کا صحیح تلفظ کرنا اور انہیں درست مخرج کے

ساتھ بیان کرنا۔ حروف کا مخرج ادا کرنے میں ہونٹ، زبان اور تالو کی حرکتوں یا

ان کی خفیف جنبشوں اور موڑ وغیرہ کا استعمال جاننا بچوں کے لیے بہت ضروری ہے اور یہ جب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب کہ اُستاد خود ان نکات کا عالم ہو۔ اگر استاد میں یہ سب اوصاف موجود ہوں تو اس کی براہ راست تعلیم کے ساتھ نقل و تقلید کے ذریعے بھی بچوں کے تلفظ، لب و لہجہ اور بول چال پر بہت جلد اچھا اور گہرا اثر پڑ جانا یقینی ہے۔ صحت تلفظ کے لیے یہ ضروری ہے کہ استاد بچوں کو حروف کے صحیح مخارج بتائے اور ہر مخرج کا ادا کرنا سکھائے۔ انہیں حروف کی شناخت اور ان کے جوڑنے کے مسلسل مواقع بہم پہنچائے اور حرکات یا اعراب کے استعمال سے حروف والفاظ کی بدلتی ہوئی آوازوں سے واقف ہونے کے لیے متواتر اور کافی مشقیں دیتا رہے۔ بچوں کو حروف کا صحیح مخرج سکھانے کے لیے ذیل میں مختلف حروف کے مخارج کی مختصر سی فہرست دی جاتی ہے۔ تاکہ اُستاد کو اس سلسلے میں کوئی مشکل باقی نہ رہے۔

ع۔ہ	:	گلے کے نیچے ان کی آواز نکلتی ہے
خ۔ق	:	گلے سے کوئے کے پاس انہیں ادا کیا جاتا ہے
ک۔گ	:	کوئے کے اوپر سے ادا کیا جاتا ہے
ش، ج، ح، ث، زے	:	وسط زبان اور تالو سے
ل، ن، ر، ژ	:	نوکِ زبان اور اوپر والے سامنے کے دانتوں سے
ت، ٹ، د، ڈ	:	نوکِ زبان اور اوپر والے دانتوں کی جڑ سے
س، ز	:	نوکِ زبان اور نیچے والے دانتوں سے
ف	:	نیچلے ہونٹ اور اوپر والے دانتوں سے
ہ	:	نوکِ زبان اور اوپر والے دانتوں کی جڑ اور نیچلے ہونٹ کے ملانے سے
ب، پ، م، و	:	دونوں ہونٹوں سے مل کر بنتے ہیں

تفصیل: الفاظ اس طریقے سے صاف صاف بیان کئے جائیں کہ دوسرے اُن کو صاف سُن سکیں اور سمجھ سکیں اس کا دار و مدار صرف صحیح تلفظ اور روانی پر ہے۔ بچہ جو کچھ بھی بولے منہ کھول کر اور زبان اور ہونٹ کو مناسب حرکت دے کر بولے تاکہ دوسروں کو اس کے الفاظ سننے اور سمجھنے میں وقت نہ آجائے۔ بچوں میں یہ صفت صحیح تلفظ اور روانی کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔

روانی: اس کا مطلب یہ ہے کہ عبارت بچوں سے موقع اور محل کے مطابق کسی جھجک، رُکاوٹ یا تکلف کے بغیر مناسب رفتار سے رواں پڑھایا جائے۔ روانی کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ بچہ کسی رٹٹی ہوئی نظم، گیت یا حساب کے پہاڑے کی طرح اُن دیکھی یا اُن پڑھی ہوئی عبارت فر فر سنا چلا جائے یا الفاظ اور فقروں کو دبتا دباتا ہوا زبان کو گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑاتا جائے بلکہ اس سے مدعا صرف یہ ہے کہ بچہ عبارت کو مناسب رفتار اور صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے اور ضروری مقامات پر ٹھہر جانے یا اپنی رفتار کو کم کرنے کا گریکھ لے۔ پڑھنے میں روانی پیدا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بچہ حروف و الفاظ کا تلفظ کرنے کے لیے منہ، زبان اور ہونٹوں کے مناسب پھیلاؤ اور جنبشوں سے بھی واقف ہو۔ تجربے سے معلوم ہوا ہو کہ طریقہ تہجی سے پڑھاتے ہوئے بچوں میں علی العموم رواں پڑھنے کی صلاحیت جلد پیدا نہیں ہو جاتی۔ البتہ ”دیکھو بولو“ طریقہ سے اُن میں یہ خوبی جلد پیدا ہو جاتی ہے۔

تغیر لحن

اس کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت کے مطابق الفاظ کے اتار چڑھاؤ یا آوازوں میں حسب ضرورت تبدیلی کی جائے۔ تغیر لحن بھی اسی قدر ضروری ہے کہ جس قدر تاکید۔ اگر اُستاد یا بچہ مسلسل طور ایک ہی انداز یا لحن میں پڑھتا چلا جائے تو

اس سے خود اس کی طبیعت میں بے کیفی اور فسادگی پیدا ہو جائے گی۔ اس پر مستزاد یہ کہ عبارت بھی سامعین پر اپنا اثر ڈالنے سے رہ جائے گی۔ اس لیے اُستاد پر یہ لازم آتا ہے کہ عبارت میں جس قسم کا مضمون بیان کیا گیا ہو اور جس قسم کے الفاظ استعمال کئے گئے ہوں اُن کے عین مطابق وہ لُحْن اور لہجہ اختیار کرتا جائے اور عبارت کے مفہوم کے مطابق اسے بدلتا چلا جائے۔ تاکہ بچوں پر عبارت اور الفاظ کا مفہوم نہ صرف پوری طرح واضح ہو جائے بلکہ ان کا دل اور ذہن بھی اس سے متاثر ہو جائے اور اُن کے خیالات اور جذبات میں وقت و وقت پر حسب ضرورت انقلاب آتا رہے۔

اعراب: زیر، زیر اور پیش، سکون اور تشدید کو اعراب کہتے ہیں۔ چونکہ اردو تحریر میں اعراب نہیں لگائے جاتے۔ اس لیے طلبہ اکثر و بیشتر عبارت خوانی کے وقت زیر کی زیر اور زبر کی جگہ زیر پڑھتے ہیں۔ مدرس کو اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ طلبہ عبارت خوانی کے وقت صحیح تلفظ سے واقف ہوں اور آئندہ الفاظ کے تلفظ میں غلطیاں نہ کریں۔ صحیح تلفظ کی مشق بار بار کلاس میں ہی کروانی چاہیے تاکہ طلبہ کو ذہن نشین ہو جائے۔

رموز و اوقاف (Punctuation)

ہر زبان میں عبارت کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے کچھ علامات اور نشانات ہوتے ہیں انہیں اوقاف یا رموز اوقاف کہا جاتا ہے۔ تحریر میں جملوں کو الگ الگ کرنے پر یگراف بنانے، تسلسل کو قائم رکھنے، معنی و مفہوم اور مطالب کو واضح طور پر ظاہر کرنے کے لیے مختلف علامتوں اور نشانیوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ان علامتوں کی واقفیت سے عبارت میں اظہار خیال کا صحیح ڈھنگ معلوم ہوتا ہے۔

اُردو میں عام طور پر رموز و اوقاف کی جو علامتیں استعمال ہوتی ہیں وہ

حسب ذیل ہیں:

علامت	انگریزی نام	اردو نام
,	Comma	سکتہ/وقف خفیف
;	Semi Colon	نیم وقفہ
:	Colon	وقفہ
.	Full Stop	وقف کامل
()	Brackets	قوسین/خطوط وحدانی
“ ”	Inverted Commas	واوین
?	Note of Introgation	سوالیہ نشان/علامت استفہام
!	Sign of Exclamation	علامت استعجاب، تاسف، ندائیہ، فجائیہ
.....	Dots	علامت نقاط
—	Poetic Symbol	علامت بسط

اب ہم رموز و اوقاف کی مختلف علامتوں کے بارے میں جانکاری حاصل کرتے ہیں۔

(۱) سکتہ (Comma) (،): یہ اُلٹی واو کی شکل میں لکھا جاتا ہے جب ہی جملے میں کئی باتوں کا بیان ہو تو ان کے درمیان یہ علامت آتی ہے۔ کما (Comma) اس کا انگریزی نام ہے۔ اس کے استعمال کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ عبارت کے ٹکڑے اس طرح الگ نظر آتے ہیں کہ مطلب واضح ہو جاتا ہے جیسے بال جبریل، ضرب کلیم اور بانگِ درا اقبال کی تصانیف ہیں۔ احمد، محمود اور امتیاز دوست ہیں وغیرہ وغیرہ۔

(۲) نیم وقفہ (Semi Colon) (;): جب سکتے سے زیادہ ٹھہراؤ کی

ضرورت پڑے تو نیم وقفہ استعمال کرتے ہیں جیسے الفاروق؛ المامون؛ موازنہ انیس و دبیر؛ یہ سب کتابیں شہلی کی ہیں۔

(۳) خط فاصل/ختمہ/وقف کامل (Full Stop) .: یہ علامت مکمل جملے

کے خاتمے پر لگائی جاتی ہے۔ جہاں یہ علامت ہو وہاں مکمل ٹھہراؤ ہوتا ہے اور جملہ ختم ہو جاتا ہے۔ جب ایک بات یا خیال کسی جملے میں مکمل طور پر ادا ہو جائے اور دوسری بات شروع کرنی ہو تو آخری لفظ کے بعد خط فاصل یا وقف کامل لگایا جاتا ہے جیسے صبح و رزش کرنے سے صحت اچھی رہتی ہے۔ مخففات یعنی Abbreviations کے بعد بھی یہ علامت لگاتے ہیں جیسے بی۔ اے، ایم۔ اے، ایم۔ ایل۔ اے وغیرہ۔

علامت استفہام: (Sing of Interrogations): کسی جملے کے آخر

میں یہ علامت ہو تو وہ سوالیہ جملہ کہلاتا ہے یا سوال پوچھنے کے موقع پر یہ علامت استعمال کی جاتی ہے جیسے: یہ کیا ہے؟ وہ کون ہے؟ آپ کا نام کیا ہے؟ وغیرہ۔

فجائیہ! (Sign of Exclamation): یہ علامت تعجب یا تاسف یا غم یا

خوشی کے موقع پر جملہ کے آخر میں استعمال کی جاتی ہے جیسے: واہ! گلاب کا پھول کتنا حسین ہے! ہائے! افسوس وہ اس دنیا سے چل بسا۔ اُف! وہ غم میں مبتلا ہے۔

توسین: (Brackets) (): ان کو خطوط وحدانی بھی کہتے ہیں۔ کسی چیز کی

تشریح یا تحریر کے درمیان کسی جملہ معترضہ کو شامل کرتے وقت یہ علامت استعمال کی جاتی ہے جیسے عبدالکلام (جو ہندوستان کے صدر رہ چکے ہیں) بہت بڑے سائنس دان ہیں۔

واوین: (Inverted Commas) ” “: کسی کا قول اُسی کے الفاظ

میں نقل کیا جائے یا کوئی سچائی وغیرہ لکھی جائے تو اس وقت یہ علامت استعمال کی جاتی ہے۔ جیسے: رشید احمد صدیقی نے فرمایا ہے کہ ”غزل اردو شاعری کی آبرو ہے“، ”لاچ بری بلا ہے“، ”ایمانداری سب سے اچھی چیز ہے“، ”اتفاق میں طاقت ہے“ وغیرہ وغیرہ۔

علامت نقاط: (Dots).....: کسی بات، اقتباس یا شعر کو درمیان سے حذف کرتے وقت کچھ نقاط ساتھ ساتھ لگا کر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کچھ عبارت چھوڑ دی گئی ہے یا تو اس خیال سے کہ وہ غیر ضروری سمجھی گئی یا کچھ پہلے اور بعد میں آنے والی عبارت کو پڑھ کر خود ہی وہ چھوڑا ہوا حصہ ذہن میں آجائے گا مثلاً

ناز کی اُس گلاب کی سی ہے

دل ناداں ہوا کیا ہے

آخر اس درد کیا ہے

یا پھر اختصار کے لیے بھی علامت نقاط کا استعمال کیا جاتا ہے مثلاً:

رشید سخت محنتی تھا مگر.....

علامت بسط: کسی شاعر کے تخلص کو لکھتے وقت اُس لفظ کے اوپر یہ نشان استعمال کیا جاتا ہے اس کو علامت بسط کہتے ہیں۔ جیسے اسد اللہ خان غالب، اسد اللہ خان نام غالب، مولانا الطاف حسین حالی، الطاف حسین نام حالی تخلص وغیرہ وغیرہ۔

مختصر یہ کہ اردو کی درس و تدریس میں اعراب، رموز و اوقاف کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر درس و تدریس کے دوران ان تمام اجزاء یا طریقہ کار کا صحیح استعمال نہ کیا جائے تو کسی بھی موضوع یا مضمون کے ساتھ انصاف نہ ہو سکے گا۔

گہرا مطالعہ

(Intensive Reading)

گہرا مطالعہ یہ مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کو عمیق مطالعہ یا غائر مطالعہ یا تفصیلی مطالعہ یا وسیع مطالعہ سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ایسا مطالعہ ہے جو پوری واقفیت حاصل کرنے کے طور پر کیا جاتا ہے۔ اس مطالعہ سے عبارت یا مضمون غور و فکر سے پڑھا جاتا ہے۔ چونکہ مضمون پڑھتے وقت اُس کے رموز و اوقاف اور اس کا مرکزی خیال کے بارے میں بڑی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس مطالعہ سے سب کچھ سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے جو کہ متن میں ہوتا ہے۔ اس قسم کا مطالعہ اکثر و بیشتر ثانوی اور اعلیٰ طبقوں کی جماعتوں میں ہوتا ہے۔ گہرائی سے مطالعہ کرنے کی بناء پر ہی ہم مضامین کی اصل حقیقت دریافت کر سکتے ہیں۔

ابتدائی سطح پر اگر اس مطالعہ سے کام لیا جائے تو اس کا نام تاکیدی پڑھائی ہے کیونکہ کسی لفظ یا لفظ کے کسی حصے پر زور دینے کو تاکید کہتے ہیں۔ تاکید کی مدد سے لفظ کا مطلب اور مفہوم فوراً واضح ہو کر سمجھ میں آتا ہے۔ اس طرح سے لفظ کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ لفظ کی اہمیت سمجھنے سے جملوں کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ تاکید کو ترک کرنے سے لفظ، جملہ یا عبارت کا وہ اثر باقی نہیں رہتا جو اس کے مفہوم میں مضمر ہوتا ہے۔ نثر ہو یا نظم دونوں میں موقع اور محل کے مطابق تاکید کی یکساں ضرورت پڑتی ہے۔ تاکیدی پڑھائی میں تغیر لحن شامل ہے جس کا مطلب ہے آواز کا اتار و چڑھاؤ۔ ادبی زبان میں آواز کے چڑھاؤ کو تاکید اور اتار کو تخفیف کہتے

ہیں۔ عبارت میں جمیع ایسے ہوتے ہیں جن پر مضمون نگاری میں خاص زور دیا جاتا ہے۔ اُردو مدرس کا اولین فرض ہے کہ وہ عبارت خوانی کرتے وقت نہ صرف خود تغیر لحن کا خاص خیال رکھے بلکہ طلبہ کی عبارت خوانی کرتے وقت اُن کی رہنمائی کرے۔

اس طرح ابتدائی سطح پر اس قسم کے مطالعہ کو تاکید مطالعہ کہتے ہیں جب کہ ثانوی اور اعلیٰ کلاسوں میں یہ گہرا مطالعہ یا عمیق مطالعہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اعلیٰ سطح پر اس قسم کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ چونکہ ثانوی اور اعلیٰ سطحوں پر طالب علم کی بصیرت تیز ہوتی ہے۔ قوتِ فکر بلند ہوتی ہے اس لیے گہرا مطالعہ ان طلبہ کے لیے سودمند رہتا ہے۔ اس لیے گہرا مطالعہ کی اپنی افادیت ہے۔

۱۔ گہرا مطالعہ سے طلبہ عبارت یا مضمون بڑی گہرائی کے ساتھ واقفیت حاصل کرتے ہیں۔

۲۔ اس میں عبارت کی قرأت، الفاظ کا تلفظ اور ان کے معانی، مرکبات کی تشریح و توضیح، صرف و نحو کے نکات، محاورات، استعارات، تشبیہات و علامات کا استعمال اور مفہوم کی تشریح، اسلوب بیان کی خصوصیت اور خیالات کی نوعیت کو سمجھنے میں بہتر اقدام کئے جاسکتے ہیں۔

۳۔ ثانوی کلاسوں میں گہرے مطالعہ کے ذریعہ مطالعہ ادب کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

۴۔ اس مطالعہ سے طلباء میں قوتِ فکر، قوتِ تمیز اور قوتِ ادراک کو تربیت ملتی ہے۔ اور طالب علم، علم کے نور سے روشناس ہو جاتا ہے۔

۵۔ بنیادی کلاسوں میں بچے تاکید کی طور زبان سیکھتے ہیں۔

غرض کہ مطالعہ کے اقسام میں گہرے مطالعہ کی بڑی اہمیت و افادیت ہے۔

جہاں فائدے ہیں وہ کچھ خامیاں بھی ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

- ۱۔ یہ عمل رہنمائی چاہتا ہے۔ اس لیے مدرس میں ایسی صلاحیت ہو کہ وہ بچوں کو اس قابل بنائے تاکہ وہ یعنی بچے اپنی اپنی سطح پر گہرائی سے مطالعہ کریں۔
- ۲۔ چونکہ کتابوں کی دنیا بہت وسیع و عریض ہے اور وقت بہت کم ہے۔ گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے میں بہت وقت درکار ہے تاکہ نفس مضمون سمجھ میں آئے ورنہ اس قسم کا مطالعہ فضول اور ضائع ہو جاتا ہے۔

سرسری مطالعہ

(Extensive Reading)

اسے سرسری مطالعہ یا سطحی مطالعہ بھی کہتے ہیں۔ اس قسم کے مطالعہ میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مواد کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور عبارت کا مفہوم بغیر آواز پیدا کئے جلد از جلد اخذ کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے مطالعہ میں طلبہ عبارت کو مناسب رفتار کو کم کرنے کا گریسکھ لیتے ہیں۔ نیز عبارت کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے اور ضروری مقامات پر ٹھہرنے کی مہارت بھی سیکھ لیتے ہیں۔ پڑھنے میں روانی پیدا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ طلبہ حروف اور الفاظ کا تلفظ کرنے کے لیے منہ، زبان اور ہونٹوں کے مناسب پھیلاؤ اور جنبشوں سے بھی واقف ہوں۔ نیز سرسری مطالعہ کا مطلب ہر لفظ کو اور اُن کے ارکان کو واضح طور سے ادا بھی کرنا ہوتا ہے اس لیے پڑھنے کی رفتار نہ تو آہستہ ہو اور نہ تیز بلکہ اعتدال پر ہو۔ اس لیے اس قسم کے مطالعہ کو تفصیل خوانی بھی کہتے ہیں۔ چونکہ اکثر بچے بہت آہستہ رُک رُک کر پڑھتے ہیں یا ایک ہی دوسانس میں پورا سبق پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دونوں صورتیں تفصیل کی نفی کرتے ہیں۔ اس قسم کا مطالعہ تمام منزلوں میں حسب ضرورت جاری رہتا ہے۔ اس قسم کے مطالعہ میں پڑھی ہوئی عبارت پر مجموعی طور سے آزادانہ تبصرہ کرانے کی عادت ڈال کر زیادہ سے زیادہ مطالعہ کا شوق پیدا کرنا اور اس کی طرف رغبت دلانا ہے۔

سمجھا جاتا ہے اس کے لیے مڈل اور ہائی کلاسوں میں لائبریری کی چھوٹی چھوٹی کہانیوں والی کتابوں یا سکول میگزین کا تعارف بچوں سے کرایا جاتا ہے۔ زیادہ اس امر پر زور دیا جاتا ہے کہ مصنف کا مفہوم یا مضمون کا مرکزی نکتہ نظر کیا ہے۔ سرسری مطالعہ کا مقصد یہ بھی ہے کہ اُستاد طلبہ کو زبان سیکھنے کی ایسی تربیت دے کہ وہ سطحی مطالعہ کر کے نفس مضمون کو سمجھنے کی صلاحیت اپنے میں پیدا کریں۔

موازنہ: گہرا مطالعہ اور سرسری مطالعہ

گہرا مطالعہ کی وضاحت کی گئی جب کہ گہرے مطالعہ میں گہرائی یا غور کے ساتھ پڑھائی ہوتی ہے۔ اس میں عبارت کا بالکل سوچ سمجھ کر اور قوت ادراک سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور اس مطالعہ کرنے میں کافی وقت درکار ہے۔ گہرا مطالعہ ثانوی کلاسوں کے لیے موزوں رہتا ہے کیونکہ اس سطح پر طلبہ کا ذہن اس قابل ہوتا ہے کہ وہ غور و خوض کر کے مطالعہ کریں اور کتاب یا عبارت کے مفہوم کو غور سے سمجھیں اس لیے اس قسم کے مطالعہ کو غائر مطالعہ بھی کہتے ہیں۔

سرسری مطالعہ میں سطحی طور یا طائرانہ طور مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس قسم کے مطالعہ کو طائرانہ مطالعہ بھی کہتے ہیں۔ اس میں وقت کم ہوتا ہے اور مواد حاصل کرنا اس مطالعہ کا مقصد ہے۔ جلدی جلدی مطالعہ کرنے سے اس قسم کا مطالعہ اعلیٰ درجوں کے طلبہ کے لیے موزوں رہتا ہے۔ کیونکہ سطحی مطالعہ، تب ہی کامیاب رہے گا جب طلبہ غائر مطالعہ کے عادی بن چکے ہوں گے۔ اور غائر مطالعہ میں صحیح تربیت حاصل کی ہوگی۔ اس لیے یہ دونوں اقسام مطالعہ کی اہمیت میں اپنا اپنا مقام رکھتے ہیں۔ مدرس کو چاہیے کہ وہ بچوں میں مطالعہ کی ایسی تربیت پیدا کریں تاکہ وہ

موضوعات میں مطالعہ کرنے کے اہل بن جائیں

مطالعہ کے بارے میں ابراہیم لنکن رقمطراز ہیں: ”کتابوں کا مطالعہ دماغ کو روشن کرتا ہے“ یہ بالکل صحیح ہے۔ واقعی مطالعہ انسان کو ذی علم اور وسیع النظر بناتا ہے۔ انسانی شعور اور ادراک میں بھی بے پناہ اضافہ ہوتا ہے اور مطالعہ سے انسانی دل و دماغ کے درتچے روشن ہوتے ہیں اور مطالعہ ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ نیز معلومات اور قابلیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

بلند آواز سے پڑھنا (مطالعہ بالجہر)

مطالعہ بالجہر ایک مبتدی کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ چلچلاتی دھوپ میں ایک پیاسے اور پیادہ مسافر کے لیے پانی۔

اس کے کچھ نمایاں فائدے یہ ہیں:

(۱) صحیح تلفظ

استاد کے بلند آواز میں پڑھنے سے بچے براہ راست تعلیم یا تقلید کے ذریعے صحیح تلفظ سیکھتے ہیں اور درست لب و لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ اُن کے لیے ابتداء میں قرأت کی دوسری خامیوں کو دور کرنا صرف استاد کے بلند آواز میں پڑھنے سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ بلند آواز سے پڑھنے کا طریقہ اُس وقت تک جاری رکھنا ضروری ہے جب تک کہ بچوں کا تلفظ، لب و لہجہ اور طرزِ ادا بالکل درست اور حنا میوں اور غلطیوں سے بالکل پاک ہو جائے۔

(۲) صحیح اظہار مطلب

بچوں سے تفصیل، تاکید اور تغیر لُحْن کی پیروی بلند آواز میں پڑھا کر ہی کرائی جاسکتی ہے۔ بچہ جب بلند آواز سے پڑھتا ہے تو تاکید اور تغیر لُحْن سے فوراً پتہ چلتا ہے کہ اُس نے عبارت کا مفہوم یا مطلب کیا ہے۔ تاکہ سمجھ لیا ہے۔

جب بچے میں پیدا ہو جاتی ہے تو وہ لُحْن بدلنے، روانی کے ساتھ پڑھنے اور الفاظ کا مناسب مجموعہ بنانے اور ضروری الفاظ پر دباؤ ڈالنے کے قابل خود بخود ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی قابلیت پیدا ہونے کے ساتھ ہی وہ عبارت کا صحیح مطلب بیان کر سکتا ہے۔

(۳) ترقی کے لیے رشک

بلند آواز سے پڑھ کر بچوں کی انفرادی خوبیاں جماعت میں ظاہر ہو جاتی ہیں اور اس طرح ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی باتیں سوچنے لگتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ خوب محنت کرنے لگ جاتے ہیں۔ اور یوں اُن میں سچی زندگی کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا شوق، طلب، جستجو اور سعی مسلسل کی وہ چنگاری پیدا کرتا ہے جس کے بغیر انسانی زندگی راکھ کے ڈھیر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

(۴) خطابت

بلند خوانی سے بچوں میں خطابت، بحث و مناظرہ، مقالہ خوانی یا اس قسم کے دوسرے علمی ہنگاموں میں حصہ لینے کی صلاحیت پیدا کی جاسکتی ہے۔

(۵) مستعدی قائم رہنا

بلند آواز سے پڑھاتے ہوئے بچوں میں ایک طرح کی مستعدی قائم رہتی ہے۔ ان کے خیالات میں یکسوئی آ جاتی ہے اور وہ توجہ اور ضبط سے اپنے کام میں محو ہو جاتے ہیں۔ ان کے پڑھنے اور نظر کی رفتار میں توازن اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور مدرس کو سبق کی طرف انکی توجہ مرکوز کرانے میں کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔

(۶) ذہنی معیار اور قوتِ یادداشت نشو و نما پاتے ہیں

مطالعہ بالجبر سے قوتِ یادداشت کو فروغ ملتا ہے۔ جس سے بچوں کا ذہنی

معیار بڑھ جاتا ہے اور مضمون یا عبارت کے حفظ کرنے میں ان کو مدد ملتی ہے۔ اور ساتھ ساتھ قوتِ سمع بھی ترقی پاتی ہے۔

اوپر کی خصوصیات اور فائدوں کو دیکھ کر آسانی کے ساتھ مطالعہٴ بالجمہر یا بلند خوانی کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور استاد کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جوں جوں طلباء تعلیم میں ترقی کرتے جائیں اور ان کا ذہنی معیار بڑھتا چلا جائے۔ مطالعہٴ بالجمہر کو دھیرے دھیرے محدود کر کے انہیں خاموش مطالعہ کا عادی بنادیا جائے۔

مطالعہٴ بالجمہر اگرچہ بنیادی جماعتوں کے لیے ضروری ہے اور اس طریقہ تدریس میں فوائد کے ساتھ ساتھ کچھ کمزوریاں اور خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ جن کا ذکر حسب ذیل ہے:

۱۔ بولنے سے تھکن پیدا ہوتی ہے۔

۲۔ وقت بہت لگتا ہے۔

۳۔ اعصاب پر زور پڑتا ہے۔

۴۔ ذہن پر دباؤ پڑتا ہے۔

۵۔ دوسروں کے عمل میں خلل پڑتا ہے۔

۶۔ سب بچوں کو ایک ہی رفتار سے چلنا پڑتا ہے۔

۷۔ اگر خوش خوانی کے اصولوں کے مطابق بلند خوانی نہ کی جائے تو سننے والوں پر اس کا ناموافق اثر پڑتا ہے۔

مختصر یہ کہ مطالعہٴ بالجمہر ہر استاد اور طالب علم کے لیے ضروری ہے اس لیے اُن کو چاہیے کہ وہ خود بھی مطالعہٴ بالجمہر کی اہمیت و افادیت مد نظر رکھتے ہوئے بچوں میں اس کی ترویج کریں۔ اور طلباء کو غور و فکر میں مصروف رکھ سکیں۔ کیونکہ سوالات کی مدد سے طلبہ کسی بات کا ظاہر کرنا سیکھتے ہیں۔ تنقید کرنا سیکھتے ہیں اور بات میں

اضافہ کرنا سیکھتے ہیں یا پھر تفویضات میں اشاروں کی مدد سے نتائج کا اطلاق کرنا سیکھتے ہیں۔ اس طرح بلند خوانی کے اس تصور سے عملی طور پر بچوں تک علم کا ابلاغ ہو جاتا ہے۔ ان میں گہری فکر، باہمی اشتراک، اظہار شوق و دلچسپی، سکولی کاموں کی طرف مثبت رویہ، جماعتی ذمہ داری اور شخصی اختلافات کی یہ عدم موجودگی یہ ساری باتیں مطالعہ بالجبر کے تصور میں آ جاتی ہیں۔ اس لیے زبان کے اُستاد کو چاہیے کہ وہ بلند خوانی کے کام میں طالب علموں کی راہ نمائی کرے اور بلند خوانی کے واضح مقاصد کا تعین کریں اور طلباء کو زیادہ سمجھ بوجھ اور صفائی کے ساتھ آواز بلند پڑھنے کی تربیت دیں۔ بلند خوانی کے لیے جو مہارتیں درکار ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) ادائیگی (۲) آواز کا اُتار و چڑھاؤ (۳) اظہار

(۱) ادائیگی

اس کے بارے میں پہلے بھی جانکاری دی گئی کہ الفاظ یا عبارت کی ادائیگی میں کن کن باتوں کا خیال رکھا جائے۔ ان میں خوش خوانی تمام اصول درج ہیں جن کا ذکر پہلے کیا گیا۔

(۲) اُتار و چڑھاؤ (زیرو بم) آواز بلند

آواز بلند مطالعے کی اہم مہارت ہے۔ پڑھتے وقت آواز میں ایک روح پھونکی جاسکتی ہے۔ آواز بلند پڑھتے وقت اُستاد کو ان الفاظ اور فقرات کی نشاندہی کر لینی چاہیے جن پر خاص طور سے زور دینا مقصود ہو۔ نظم کی تدریس میں خصوصیت کے ساتھ اس کے مواقع درپیش آسکتے ہیں۔ مصرعوں کی موزونیت اور ہم آہنگ کا بہت کچھ انحصار اسی پر ہے۔

(۳) اظہار

بلند آواز کے ساتھ پڑھنے میں مہارت اظہاریت ہے۔ یعنی عبارت اس

طرح پڑھ کر سنائی جائے کہ سامع تک مفہوم کی ترسیل ہو سکے اور جن خیالات، جذبات اور محسوسات کو مصنف نے پیش کیا ہے۔ اس کی صحیح ترجمانی ہو سکے۔

زبان کے استاد کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ طالب علموں میں بلند خوانی کی مہارت پیدا کرے۔ وہ عام طور سے اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ بلند خوانی کے کام میں طالب علموں کی کس طرح رہنمائی کی جائے۔ اس سلسلے میں ان کے تصورات اکثر و بیشتر مبہم ہوتے ہیں۔ لہذا انہیں چاہیے کہ وہ بلند خوانی کے واضح مقاصد کا تعین کریں۔ اور طلبہ کو زیادہ سمجھ بوجھ اور صفائی کے ساتھ آواز بلند پڑھنے کی تربیت دیں۔ اگر استاد اس فن کے تمام رموز سے واقف ہے تو یقیناً استاد اور شاگرد دونوں کو کامیابی ہوگی۔

خاموش مطالعہ

(Silent Reading)

اسے زیر لب مطالعہ یا حیطہ مطالعہ بھی کہتے ہیں۔ اس کا مقصد نفس مطلب تک رسائی حاصل کرنے کا ہے۔ جوں ہی اُستاد کو یقین ہو جائے کہ طلبہ مطالعہ بالجہر کے خرمن سے سارے خوشے سمیٹ کر ذہن کی جھولی میں ڈال چکے تو انہیں احتیاط کے ساتھ خاموش مطالعہ کی راہ پر ڈال دے اور خیال رکھے کہ خاموش مطالعہ کی عادت بچوں میں اتنی گہری اور پختہ بن جانا چاہیے کہ آئندہ زندگی میں وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہمیشہ خاموش مطالعہ کے پابند رہیں۔

خاموش مطالعہ کے فوائد

۱۔ اس قسم کے مطالعہ میں طلبہ نگاہ اور ذہن سے کام لیتے ہیں۔ زبان اور ہونٹوں کو ہلائے بغیر اپنی نظروں سے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام لیتے ہیں اور مطالعہ کی رفتار تیز رہتی ہے۔

۲۔ اس قسم کے مطالعہ سے بچوں میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے اور اطمینان کے ساتھ شور و غل کے بغیر کام کرنا سیکھتے ہیں۔

۳۔ خاموش مطالعہ میں طلبہ توجہ اور یکسوئی کو دیر تک قائم رکھ سکتے ہیں اگر وہ کئی گھنٹوں تک بلا ناغہ پڑھتا جائے تو نہ تھکتا ہے اور نہ اکتا جاتا ہے۔

۴۔ خاموش مطالعہ سے پڑھنے کا حقیقی لطف حاصل ہوتا ہے اور فہم و ادراک کی

- ۵۔ اعصاب پر زور نہیں پڑتا نیز وقت کی بچت ہوتی ہے۔
- ۶۔ ذمہ داری کا احساس بڑھتا ہے کیونکہ مطالعہ کے بعد سوالات پوچھے جاتے ہیں جن کا جواب دینا ہوتا ہے۔
- ۷۔ دوسروں پر اپنی آواز کا ناموافق اثر نہیں پڑتا۔
- ۸۔ خاموش اور پرسکون فضا میں توجہ کے بکھیرنے کا احتمال کم ہوتا ہے۔
- ۹۔ ہر طالب علم اپنی اپنی رفتار سے مطالعہ کے راستے پر آگے بڑھتا ہے۔
- ۱۰۔ ذاتی زندگی سے لے کر کاروباری یا عملی زندگی تک ہر جگہ خاموش مطالعہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور کم سے کم وقت میں ضروری اور زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔
- ۱۱۔ اس مطالعہ کے ذریعے خیالات، تصورات، مشاہدات اور نظریات میں وسعت پیدا کی جاتی ہے۔
- مندرجہ بالا فوائد کے باوجود اس قسم کے مطالعہ میں کچھ کوتاہیاں یا خامیاں بھی موجود ہیں۔ جو کہ حسب ذیل ہیں:
- ۱۔ اس قسم کے مطالعہ میں پڑھنے کے عمل میں جو عمدگی، خوبصورتی اور معنویت موجود ہے ان کا صحیح اظہار سامنے نہیں آتا ہے۔ وہ اپنی جگہ پر رہ کر ان کی صحیح اصلاح نہیں ہوتی ہے۔
- ۲۔ پرسکون فضاء میں اگر توجہ مرکوز نہ رہے یا دھیان کہیں اور چلا جائے تو مطالعہ بہت کم ہوتا ہے۔ نتیجتاً مطالعہ، بے سود، بے اثر اور بے سمجھ رہتا ہے۔ وقت بھی ضائع اور جسمانی قویٰ خاص کر ذہن اور بصارت پر برا اثر پڑتا ہے۔
- ۳۔ اس قسم کے مطالعہ میں کیا معلوم کہ بچے دھیان سے پڑھتے ہیں یا یونہی سر سے سرگرداں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔

۴۔ اس قسم کے مطالعہ سے خوش خوانی کے اصول یعنی اعراب کے لازم استعمال، درست تلفظ، تغیر لُحْن اور فقرہ بندی وغیرہ پوشیدہ رہتے ہیں اور بچے ان اصولوں کی واقفیت صحیح طور نہیں پاتے ہیں اور نہ ان کی اصلاح ہوتی ہے۔

چونکہ خاموش مطالعہ کو اردو کی تعلیم میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور مدرس بدوران مطالعہ ہر بچے کے قریب جا کر اس کی نگرانی اور حسب ضرورت مدد کرتا رہے۔ چونکہ خاموش مطالعہ وسطانوی اور ثنائی جماعتوں سے شروع کی جانی چاہیے اس لیے مضمون یا کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ہر طالب علم سے ان کا خلاصہ یا مرکزی خیال ایک الگ نوٹ بک پر لکھا یا جائے۔ اونچے درجے کے طلباء سے کہا جائے کہ وہ مطالعہ کی ہوئی کتاب یا عبارت کے بارے میں اپنی رائے قلمبند کریں تاکہ اپنی علمی معلومات میں وسعت ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں نقد و نظم کا اسلوب پیدا ہو سکے۔ مطالعہ کرنے والے میں اگر تنقیدی صلاحیت موجود ہو تو وہ اچھی اور بُری کتابوں میں فرق کر سکتا ہے۔ کتابوں، مصنفوں یا شاعروں کے بارے میں قطعیت کے ساتھ اپنی رائے قلمبند کر سکتا ہے اور دوسروں کو بھی کتب بینی کی طرف خوبی کے ساتھ مائل کر سکتا ہے۔ اس طرح ہمارے طلبہ میں تنقیدی جائزہ لینے اور تبصرہ کرنے کا ملکہ پیدا ہونا بہت ضروری ہے۔ چونکہ یہ بات پہلے بھی بیان کی گئی کہ انسان کو نجی زندگی سے لے کر کاروباری زندگی تک ہر جگہ خاموش مطالعہ کی ضرورت پیش آتی ہے اور اس کے ذریعے کم سے کم وقت میں ضروری معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ خاموش مطالعہ کس عمر میں کیا جائے؟

چونکہ تحتانی تعلیم کا آغاز گفتگو یا زبانی بول چال سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد بلند

نونی کی مشق ہوتی ہے۔ چوٹی عمر میں بچے سکولوں میں داخل کئے جاتے ہیں۔

تو ابتداء سے ہی سچے اور تلفظ وغیرہ کی دشواریوں پر عبور حاصل کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ انہیں بلند خوانی پر خاصا عبور حاصل ہو جاتا ہے اور ماہرین تعلیم کا کہنا ہے کہ بچوں کو پرائمری درجوں تک مطالعہ بالجبر کی تربیت دی جائے۔ اس کے بعد وسطانوی اور ثنائی کلاسوں سے ان میں خاموش مطالعہ کی عادت پیدا کی جائے چونکہ خاموش مطالعہ کے تین اہم مقاصد ہیں:

(۱) توفیر لغات (۲) زود خوانی (۳) مطلب فہمی

(۱) توفیر لغات

یعنی الفاظ یاد کرنا۔ لغت کا استعمال سیکھنا۔ یہ صرف اونچے درجوں میں ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ استاد کی عدم موجودگی میں طلبہ خاموش مطالعہ کے دوران لغت کا استعمال کر سکتے ہیں جس سے اُن کے علم میں اضافہ ہونے کا امکان ہے۔

(۲) زود خوانی

زود خوانی سے مراد ہے جلدی جلدی پڑھنا۔ اس لیے اس قسم کے مطالعہ کو حیطہ مطالعہ بھی کہتے ہیں۔ جب ہم کوئی عبارت پڑھتے ہیں تو ہماری نگاہ عموماً زیر مطالعہ الفاظ سے آگے ہوتی ہے۔ اس فاصلے کو حیطہ مطالعہ کہتے ہیں۔ حیطہ مطالعہ یا زود خوانی جس قدر زیادہ ہو اسی قدر مطالعہ کی رفتار زیادہ اور تیز ہوگی۔

(۳) مطلب فہمی

خاموش مطالعہ کی اولین شرط ہے کہ عبارت خاموشی کے ساتھ اور غور و فکر سے پڑھی جائے تاکہ مضمون یا عبارت سمجھ میں آئے۔ اس لیے عبارت پڑھنے کے بعد کتاب الٹ دیں تاکہ تفہیم عبارت کی جانچ کی جا سکے اور اس بات کا اندازہ لگایا جاسکے کہ طلباء نے عبارت سے خاطر خواہ مفہوم اخذ کر لیا ہے یا نہیں۔ مطالعہ کے اختتام پر بچوں سے جانچ کے طور سوالات پوچھے جائیں تاکہ اس بات کا اندازہ

ہو سکے کہ طالب علم نے کس مقام پر سمجھنے میں غلطی کی ہے اور تفہیم کی کیا دشواریاں سامنے آئی ہیں۔ شروع شروع میں سوالات سہل ہونے چاہئیں۔ اُن میں کسی قسم کے ابہام کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے اور ابتدائی سوال توجہ مبذول ہو۔ تاکہ مطلب فہمی کی جانچ ہو جائے۔

تحریر کی اہمیت و افادیت اور معنی

(Importance and Meaning of Writing)

لکھنا ایک ایسا شریف اور عظیم فن ہے کہ یہ علم کے بغیر کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ لکھنا اور پڑھنا حصول تعلیم کے دو پہلو ہیں اور دونوں کے دونوں اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں۔ ان دونوں کا وجود ایک دوسرے کے بغیر لا یعنی ہے بلکہ یوں کہیے کہ اپنی ترقی اور بقا کے لیے یہ دونوں ایک دوسرے کی مدد اور تعاون کے محتاج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علم کے لیے ان دونوں کا سیکھنا ضروری ہے۔ ان دونوں میں سے ایک کی کمی دونوں کی نفی کر کے طالب علم کو کسی بھی طرح منزل مراد تک پہنچنے نہیں دیتی۔

تحریر وہ محفوظ وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ایک نسل کے علم و دانش، مذہبی احکام، سماجی قوانین، اخلاقی قواعد اور سیاسی منشور کا ذخیرہ دوسری نسلوں تک حفاظت اور سہولت کے ساتھ منتقل کیا جاتا ہے۔ کوئی مہذب قوم اپنے ماضی کے تمدن و تہذیب ثقافت اور ان سے متعلق دوسری اہم تاریخی باتوں کی نشان دہی اس تحریری مواد ہی سے کر سکتی ہے۔ جو اس کے اسلاف کتابوں یا دستاویزوں کی شکل میں چھوڑ گئے ہوں۔ ہم تک تو علوم و فنون، ادب اور کلچر کا ورثہ تحریر ہی کے روپ میں آ پہنچا ہے اور ہم بھی اس قسم کا عظیم سرمایہ تحریر ہی کی صورت میں اپنے وارثوں کے لیے چھوڑ جائیں گے۔ حکومتوں کے منشور اور آئین کی دفعات جب تک مصنفوں اور سیاست دانوں کے دماغوں سے نکل کر تحریر کا جامہ پہن کر نفاذ کے عمل میں آتے ہیں۔

دینیوی معاملات سے قطع نظر بارگاہ الہی کے واجب التعمیل احکام بھی تحریر کا لباس پہن کر ہی اپنے ماننے والوں کے لیے محفوظ اور زندہ جاوید بن چکے ہیں۔ غرض تحریر ہی وہ ایک واحد ذریعہ ہے جس سے کام لے کر اپنے دل کی بات کاغذ یا کسی اور چیز پر اُتار کر دور دور تک پہنچا دیتے ہیں۔ یا اپنوں کے درمیان راز و نیاز کے سلسلے قائم کر کے غیروں کو اس سے کبھی واقف ہونے کا موقع نہیں دیتے۔ تحریر یا لکھائی کے طفیل ہم نجی یا تجارتی لین دین اور دینیوی معاملات زیادہ سے زیادہ وقت گزرنے کے باوجود نیک نیتی اور دیانت کے ساتھ بوجہ احسن نبھالیتے ہیں۔ تحریر کی عدم موجودگی میں ہم انسانی حافظے پر بھروسہ کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ انسانی حافظہ نہ اتنی عظیم ذمہ داری سنبھال سکتا ہے اور نہ یہ معاملات کو خراب اور غلط ملط ہونے سے بچا سکتا ہے اور نہ یہ معاملات کو ادھر ادھر جانے دیتا ہے۔

فن تحریر کے یہی کمالات اس کی عظمت اور اہمیت کے آئینہ دار ہیں۔ اگر تحریر معرض وجود میں نہ آتا تو انسانی منہ میں زبان رکھنے کے باوجود آج بھی ایک طرح سے بے بس اور بے زبان ہی نظر آتا۔ اور تہذیب و تمدن، علوم و فنون اور ایجاد و اختراع کی محیر العقول ترقی کی یہ صورت نہ ہوتی جو آج قدم قدم پر اپنے حبلوے بکھیرتی نظر آ رہی ہے اور نہ یہ مدرسے، کالج، یونیورسٹیاں، محکمے اور دفاتر اور دنیا کی بڑی سی بڑی لائبریریاں وجود میں آ جاتیں۔

فن تحریر کی تعلیمی اور نفسیاتی افادیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ لکھنا ایک ایسا لطیف اور بامقصد عمل ہے۔ جس سے مشاہدہ اور غور و فکر کی قوت ترقی کرتی ہے اور اعصاب و حواس کی ایک باقاعدہ تربیت ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تحریر

قوتِ حافظہ کی ترقی کا بھی موجب بن جاتی ہے۔ لکھی ہوئی عبارت بہت

کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۸۲ میں فرماتا ہے:
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدِينٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّىٰ فَاكْتُبُوهُ
وَلْيَكُتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ - ترجمہ: ایمان والوں سے مخاطب ہو کر اللہ
تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ایمان والو جب آپ آپس میں لین دین کسی مقرر
وقت تک کرو گے تو اپنا یہ لین دین یعنی قرضہ لکھ کے رکھو۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ سورہ طور کے آیت ۱، ۲، ۳ میں فرماتا ہے:

وَالطُّورِ وَكِتَابٍ مَّسْطُورٍ فِي رَقٍّ مَّنْشُورٍ

اسی طرح ایک اور جگہ سورہ قلم میں آیت نمبر ۱ یعنی پہلی آیت میں اللہ
تعالیٰ فرماتا ہے: ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ - سورہ العلق کے آیت نمبر ۱۴ اور ۵
میں فرماتا ہے: الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ -

ان آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تحریر کی ابتداء پہلے سے ہی ہوئی۔
جب کہ اللہ تعالیٰ خود تحریر کی افادیت و اہمیت واضح کرتا ہے کہ تحریر کتنا ضروری ہے
یہاں تک کہ علم کی بنیاد ہی تحریر ہے۔ جب سے بولنا یعنی زبان کی ابتداء ہوئی تب
سے تحریر کی ابتداء بھی ہوئی۔ کیونکہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔

ماہرین کے مطابق تحریر کی ابتداء اشکال کے ذریعہ شروع ہوئی۔ سب سے
پہلے پکٹو گرافی (تصویر کشی) کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد دوسری منزل آئیڈیو گرافی
یعنی (خیال کشی) آئی۔ اس منزل پر تصویر نہیں کھینچی جاتی تھی بلکہ مختلف تصاویر کو یکجا
اور مربوط کر کے اس مجموعہ کے ذریعے ایک خاص خیال اور مفہوم کو پیش کرنے کی

کوشش کی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ غالباً مصر اور بابل نینوا کی قوموں نے فنِ تحریر کو سب سے پہلے ایجاد کیا۔

زبان اور تحریر کیسے وجود میں آئے؟

اس کا صحیح سراغ لگانا مشکل ہے۔ البتہ یہ اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے کہ ابتدائی انسان نے اپنی سماجی اور معاشی ضروریات اور جذباتی کیفیت کے اظہار کے لیے کچھ آوازیں نکالی ہوں گی۔ اور جسمانی اشاروں کی مدد سے انسان کا مفہوم سمجھ لیا ہوگا۔ آگے چل کر مختلف آوازوں اور اشاروں کے معنی متعین ہو گئے ہوں گے۔ اسی طرح تبادلہ خیالات کے دوران زبان وجود میں آئی اور بعد میں بول چال کی زبان نے تحریری شکل اختیار کر لی ہوگی۔

اور زبان تین قسموں میں تقسیم ہوئی:

(۱) اشاروں کی زبان (۲) آوازوں کی زبان اور (۳) علامتوں کی زبان

یعنی تحریر

علامتوں کی زبان یعنی تحریر: جب کسی آواز یا لفظ کو علامت کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے تو وہ تحریر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن تحریر میں لفظ بے جان اور جامد رہتے ہیں۔ جب تک بولنے والا یا اظہار خیال کرنے والا ان میں روح نہ پھونکے۔ اس طرح زبان کی ابتداء سے ہی تحریر کی ابتداء بھی ہو جیسا اوپر مدلل طور بیان کیا گیا۔

اردو رسم الخط کی بنیادی جانکاری

اردو رسم الخط اصل میں فارسی تحریر ہے اور فارسی رسم الخط عربی خط نسخ کی تراشیدہ صورت ہے۔ اردو زبان ایک مرکب و مخلوط زبان ہے جس کے خاص اجزاء برج بھاشا، عربی اور فارسی ہیں۔ ان زبانوں کے علاوہ دنیا کے قریب قریب سب علمی زبانوں کے الفاظ کچھ نہ کچھ اس میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو اس زبان کے لکھنے اور پڑھنے میں بمقابلہ اور زبانوں کے چند مشکلیں پیش آنے کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے۔

جن زبانوں کے الفاظ اردو میں بکثرت آئے ہیں ان کی آوازوں کے لیے مخصوص حروف لینے پڑے مثلاً عربی زبان کے مخصوص حروف ث، ص، ض، ظ اور بھاشا کے ٹ، ڈ، ژ اور دو آنکھ والی ”ہ“ سے ملنے والے حروف بھ، پھ، ڈھ، ٹھ وغیرہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو میں حروف تہجی کی تعداد ۴۹ تک پہنچ گئی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اردو میں حروف کی شکلیں بدل جاتی ہیں اور بدلی ہوئی شکلوں کے سبب سے مبتدی لکھن میں پڑ جاتے ہیں اور ان کے لیے پڑھنا اور لکھنا لوہے کا چننا چبانا ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے انگریزی میں صرف ۲۶ حروف ہیں بچے جلد سیکھتے ہیں اور پڑھائی و لکھائی کی منزل پر آ جاتے ہیں۔

اب آئیے ذرا اردو رسم الخط پر ایک سرسری نظر ڈال کر دیکھیں کہ کہاں تک دشواری ہے اور کتنی آسانی ہے۔ اور دیکھیں کہ اردو کس طرح لکھی جاتی ہے۔

(۱) اردو تحریر میں مندرجہ ذیل حروف کی شکلیں تبدیل نہیں ہوتیں۔ صرف

مختصر ہو جاتی ہیں ج، چ، ح، خ، س، ش، ص، ض، ع، غ، ق، ک، گ، ل، ن، ی
یہ سب حروف مدور صورت میں ہیں اگر ان کا دامن کاٹ لیا جائے تو ان کی
صورت مختصر رہتی ہے اور لفظ سے پہلے یا درمیان میں لکھے جائیں تو صرف ان کی
مختصر صورت استعمال کی جاتی ہے۔ ورنہ اگر لفظ کے آخر میں آئیں یا لکھے جائیں تو
سالم لکھے جاتے ہیں جیسے صحیح۔ اس لفظ میں پہلے حرف ”ص“ کی مختصر صورت اور
حرف ”ح“ اور حرف ”ی“ کی مختصر صورتیں لکھی گئیں اور لفظ کے آخر میں حرف
”ح“ سالم آیا۔ مدرس بہت سی مثالیں بچوں کو سمجھا کر رسم الخط کے بارے
میں جانکاری دے۔

مندرجہ ذیل حروف کی شکلیں نہیں بدلتیں۔ خواہ سابق میں ہوں یا لاحق
میں ہوں یا طرفین میں ہوں۔

(ط، ظ، و، ۴)

مثلاً: طوطا، طائر، ظفر وغیرہ وغیرہ۔ ان الفاظ میں ط، و، (اور ظ اپنی شکلیں
تبدیل نہیں ہوں گی۔

مندرجہ ذیل حروف کی شکلیں کبھی بدل جاتی ہیں اور کبھی نہیں بدلتیں۔ ب، پ،
ت، ٹ، ث، د، ذ، ڈ، ر، ڑ، ز، ژ

جب لفظ کے آخر میں لکھے جائیں تو سالم لکھے جاتے ہیں۔

ہم شکل ہونے کے لحاظ سے حروف تہجی کو ترتیب کے ساتھ بچوں کو حروف نویسی
اور ساتھ ساتھ حروف شناسی کی تربیت دی جائے جیسے:

(ب، پ، ت، ٹ، ث، ف) (ج، چ، ح، خ) (د، ڈ، ذ، و) (ر، ز، ڑ، ژ)
(س، ش) (ص، ض) (ط، ظ) (ع، غ) (ک، گ) (ل، م)

باقی ماندہ حروف جو ہم شکل نہیں ان کی علیحدہ تربیت دی جائے جیسے: ق، ل،

ن، ہ، ی۔

اس طرح رسم الخط کے بارے میں بچوں کو حروف نویسی اور حروف شناسی کی تربیت دے کر اردو لکھنے کے قابل بنائے جائیں۔

اس طریقہ میں جو آسانیاں ہیں وہ یہ ہیں

- ۱۔ حروف کی شکلیں بار بار دیکھنے اور لکھنے سے ذہن میں جم جاتی ہیں۔
- ۲۔ حروف کی مختصر شکلیں جو ترکیبی حالت میں ہوتی ہیں جلد معلوم ہو جاتی ہیں۔
- ۳۔ لکھنا، پڑھنا اور ہجے کرنا، تینوں کام ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔
- ۴۔ حروف کے نام سکھائے جاتے ہیں اور ان کی شکلوں کی شناخت بھی ساتھ ساتھ کرائی جاتی ہے۔

۵۔ بعض حروف دوسرے حروف کی آواز دیتے ہیں۔ اس کی مشق ساتھ ساتھ کی جاتی ہے اور بچوں کو ایسے حروف لکھنے کے اہل بنا کر رسم الخط کی جانکاری دی جاتی ہے۔

رسم الخط کی جانکاری دینے کے لیے اور ساتھ ساتھ بچوں کو لکھنے کی تربیت دے کر ذیل کی باتوں کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔

ہم شکل حروف کی گروہ بندی کر کے ہر حرف کو پیش کرنے کے لیے کسی مادی چیز یا جانور کا انتخاب کیا جائے جو بچوں کے عام مشاہدے میں ہو اور جس سے وہ دلچسپی لیتے ہوں اور جس کا نام اس حرف سے شروع ہوتا ہے۔

منتخب چیز یا جانور کی واضح تصویر بنا کر بچوں کو دکھائی جائے۔ اس کے نام کا واضح تلفظ اخذ کرانے کے بعد اس کی آواز کا تجزیہ کر کے پہلی آواز نکلائی جائے اور مقررہ نشان دکھا کر حرف کی شکل کا تعارف کرا کے لکھوایا جائے۔

چونکہ تصاویر اور کھیل سے بچے بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ ایسے حروف، الفاظ اور

جملے ان کے لیے دلکش ہوتے ہیں۔ جو تصویروں سے مربوط ہوں۔ حروف کے کارڈ اور لفظی کارڈ، الفاظ سازی اور جملہ سازی میں بڑی دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں۔ ان سے کئی طرح کے کھیل کھلائے جاسکتے ہیں۔ کھیل بچوں کو قدرتی طور پر پسند ہوتا ہے اس لیے کھیل کا طریقہ لکھائی سکھانے میں بہت مؤثر اور دل نشین ہوتا ہے۔

بچوں کو اردو رسم الخط سکھاتے وقت اساتذہ صاحبان پر لازم آتا ہے کہ وہ اس فن میں پہلے اپنے اندر پوری قابلیت پیدا کریں اور پھر کہیں انہیں اردو لکھنا سکھانے کی ذمہ داری قبول کر لیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ابتدائی جماعتوں میں اردو لکھنا سکھانے والے اساتذہ خود حروف و الفاظ کے توازن، قد، دامن، ترشہ، عرشہ، الحنا، تشدید، نون غنہ، نون اعلان وغیرہ کی اہمیت یا ضرورت کے احساس سے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو ان سے فن آموزی کی کون سی توقع کی جاسکتی ہے۔ آج کل مدارس میں طلباء کے بدخط اور زشت نویس ہونے کی شکایت عام ہے اور یہ درست ہے کہ ابتدائی مدارس ہی میں ان کا خط بگڑ جاتا ہے اور ابتدائی مدرسوں میں یہی بگڑے ہوئے بچے جب مڈل اور ہائی سکولوں میں جاتے ہیں تو وہاں دوسری کمزوریوں کے ساتھ ساتھ تحریر کا بھداپن بھی ان کی ترقی میں مانع آتا ہے۔ معیار تحریر یا رسم الخط کے اس زوال کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ زبان پڑھانے والے اُستاد یا تو اس فن میں خود مہارت نہیں رکھتے یا اپنی فنی مہارت کو تن آسانی کی وجہ سے کام میں نہیں لاتے۔

لکھنا بجائے خود ایک ایسا با مقصد مگر پیچیدہ عمل ہے۔ ابتداء میں موٹے قلم سے لکھائی شروع کرانا چاہیے۔ جب بچوں کے ہاتھ اور انگلیوں کے اعصاب پوری طرح تربیت پالیں اور ان کا خط ایک مستقل نہج پر آجائے تو باریک قلم والے قلم کا استعمال ٹھیک رہے گا۔

خط نسخ

محققین کا خیال ہے کہ خط کوفی کے پہلو بہ پہلو یہ خط مدینہ اور مکہ میں مستعمل تھا اور قرآن مجید اس خط میں لکھا جاتا رہا ہے۔ بعض ماہرین کے نزدیک ابن فضلہ اس کا مؤجد تھا۔ جیسا کہ مولانا امتیاز علی خان عرشی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے مدرسہ کتابت کی افتتاحی تقریب میں نسخ کے بارے میں فرمایا:

”گیارہویں صدی کے شروع میں بغداد کے ایک وزیر ابن مقلہ کے ثلث کے دائروں میں کچھ گولائی بڑھانے اور کششوں میں غیر ضروری طبائی کم کرنے سے نسخ پیدا ہوا۔“

ابو الفضل اپنی تصنیف کردہ کتاب ”آئین اکبری“ میں لکھتا ہے کہ ابن مقلہ نے ۳۱۰ھ میں کہ کوفی سے ثلث، توقع، رقاع، نسخ، ریحان، محقق اور غبار ایجاد کئے۔ جہاں تک نسخ کا تعلق ہے اس کا مؤجد متعصمی کو سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کے بموجب یعقوب متعصمی (متوفی ۶۹۶ھ) نے اس میں ایک خاص حسن بھر دیا ہے۔ جس سے خط اسلامی یعنی طرز نسخ یا خط نسخ نے ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ بعضوں کی رائے ہے کہ خط نسخ ابن معقلی سے پہلے وجود میں آچکا تھا غالباً انہوں نے اس خط کی اصلاح کی تھی اور خوش نویسی کے اصول مقرر کئے تھے۔

یہ خط ترچھے حروف میں لکھا جاتا ہے۔ نسخ کا ہر دائرہ شروع سے آخر تک یکساں ہوتا ہے اور حروفوں میں کسی قدر ناہمواری پائی جاتی ہے۔ یعنی دائرے گول ہونے کے بجائے اپنا نچلا حصہ چپٹا رکھتے ہیں۔ اردو میں بھی ہزاروں کتابیں خط نسخ میں چھپائی گئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا ”الہلال“ اور مولانا محمد علی جوہر کا ”ہمدرد“

خط نسخ میں ہی چھپتے تھے۔ اس طرح خط نسخ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ خط خاص طور پر عربی رسم الخط کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اس لیے اسے قرآنی رسم الخط بھی کہتے ہیں۔ عربی اور فارسی میں اس خط کو اپنالیا گیا ہے۔

تعلیق

تعلیق کا لفظ نسخ اور تعلیق سے مرکب ہے۔ نسخ کا ”خ“ حرف مجملہ کے باعث حذف کیا گیا اس لیے لفظ ^{نستعلیق} بن گیا۔ یہ خط ایرانیوں کی ایجاد ہے۔ اس کے حروف کی نوکیں، گردنیں اور نیچے کا حصہ باریک ہوتا ہے۔ دائرے خوش نما اور گول ہوتے ہیں اچھی تلفظ کے لیے اعراب کا استعمال کرنے سے اس کے حسن کو بڑھا دیتا ہے۔

ڈاکٹر طارق عزیز نے مختلف حوالوں سے لکھا ہے کہ ”حسن بن حسین علی فارسی نے خط رقع اور خط تویق کی آمیزش سے ایک نیا خط تعلیق وضع کیا۔ حافظ یوسف سیدی یا قوت مستعصمی (پورا نام یا قوت بن عبد اللہ الدرمی المستعصمی) کو خط تعلیق کا موجد قرار دیا ہے۔ محمد سجاد مرزا نے خط تعلیق کے اجراء کا زمانہ چوتھی صدی ہجری اور پروفیسر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ کے حوالے سے تیرہویں صدی عیسوی مقرر دیا ہے۔ محتاط تحقیق سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا اجراء پانچویں صدی ہجری میں ہوا۔ خط تعلیق شاہی رسل و رسائل سرکاری کاروبار اور عام مراسلت میں استعمال ہوتا تھا۔ اس لیے اس کا تیسرا نام خط ترسل بھی مشہور ہو گیا۔ یہ خط پیچیدہ تھا۔ اس کے حرفوں کے پیچ و خم دیکھ کر قافی ایک موقع پر کہتا ہے ۔

اے زلفِ تو پیچیدہ تر از خطِ ترسل
بر دامنِ زلفِ تو مرا است تو سل

مولانا امتیاز علی عرشی کے بموجب تعلیق عربی میں لٹکانا کا مترادف ہے اور بقول ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ”مستند طور پر خط نستعلیق کا موجد میر علی تبریزی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس خط نے نسخ اور تعلیق کے ملاپ سے جنم لیا اور اس خط کے ذریعے علم خطاطی نے معراج حاصل کر لی۔ چونکہ اس کا حسن قائم بالذات ہے اس میں کشش کی نزاکت، دائروں کی لطافت اور نقطوں کی نفاست کا اپنا داخلی معیار مجال ہے جو کسی سے مستعار نہیں۔

ابوالفضل اس خط کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ”خواجہ سلمانی شش قلم نے اس خط میں کمال پیدا کیا۔ بعض افراد کی رائے ہے کہ یہی شخص خط تعلیق کا موجد ہے۔“ سلطان علی مشہدی کے اس شعر سے خط نستعلیق کی بنیادی صورت واضح ہو جاتی ہے

نسخ و تعلیق گر خفی و جلی است
 واضح الاصل خواب میر علی است
 وضع فرمود از زمین دقیق
 از خط نسق و ز خط تعلیق

خط شکستہ

خط شکستہ دراصل نستعلیق کی مختصر صورت ہے۔ اس خط کو حاکم ہرات مرتضیٰ قلی خان شاملو نے ۱۱۰۰ھ میں وضع کیا ہے۔ اس خط کا منشاء زودنو لیس ہے۔ اس کے دائرے اور شوشے ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ خط خانگی اور دفتری مراسلات کے لیے رائج ہے۔ اس سلسلے میں مرتضیٰ قلی کے میرنشی محمد شفیع نے خط شکستہ اور نستعلیق سے ایک نیا خط ایجاد کیا جسے شکستہ آمیز خط کہتے ہیں۔ ان خطوں کے علاوہ ہندوستان

میں اردو خطاطی کے تربیتی مراکز کام کر رہے ہیں۔ ان میں خط ماہی، خط گلزار، خط غبار، خط معکوس، خط ثلث، خط بہار اور خط بابری وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

چونکہ خط شکستہ خط نستعلیق کے برخلاف گھسیٹ کر لکھا جاتا ہے اور جس کے حروف شکستہ ہوتے ہیں اور عدالتوں، محکمہ پولیس اور محکمہ مال میں اس خط کا عام رواج ہے۔ خاص کر عراقی نویس حضرات حروف آپس میں ملا کر دستی مسودات لکھ کر تیار کرتے ہیں۔

عربی، فارسی اور ہندی زبانوں سے مستعار لئے گئے حروف، ان کی نئی ترتیب اور تدریس

عربی زبان کے حروف ابجد کے حساب سے اس طرح ہیں

۴	۳	۲	۱
کلمن	خطی	ہوز	ابجد
۸	۷	۶	۵
ضغظ	شخز	قرشت	سغنص

عربی زبان کے اٹھائیس (۲۸) حروف تہجی ان آٹھ لفظوں میں جمع ہیں ان کی روایتی ترتیب اس طرح ہے:

ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص ض
ط ظ ع غ ف ق ک ل م ن و ہ ی = ۲۸
نوٹ: یہ ابجدی حروف شمار کے لیے بھی آتے ہیں۔ ان میں سے پہلے نو حروف یعنی اسے لے کر ط تک اکائیوں کے لیے، ی سے لے کر ص تک دہائیوں کے لیے اور ق سے لے کر ظ تک سینکڑوں کے لیے اور باقی ماندہ حروف ”غ“ ایک ہزار کے لیے ہے۔ ایسا صرف ابجد کے حساب سے کیا جاتا ہے۔

فارسی زبان کے حروف تہجی یا حروف ہجا تعداد میں کل بتیس (۳۲) ہیں ان کی روایتی ترتیب حسب ذیل ہے:

ا ب پ ت ث ج چ ح خ د ذ ر ز ژ س ش ص ض
ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ه ی = ۳۲
درج بالا حروف تہجی یا حروف ہجا میں سے پ، چ، ژ اور گ صرف فارسی زبان سے مخصوص ہیں۔ جب کہ باقی حروف تہجی یا حروف ہجا صرف عربی زبان سے مخصوص ہیں۔

نوٹ: اوپر درج کئے گئے حروف تہجی یا حروف ہجا میں سے حرف ”ژ“ صرف فارسی زبان سے مخصوص ہے جب کہ یہ حرف نہ عربی حروف تہجی میں ہے اور نہ ہندی زبان کے حروف تہجی یا حروف ہجا میں شامل ہے۔ اس لیے یہ حرف ”ژ“ صرف فارسی زبان میں مخصوص ہے اور خالص فارسی ہے۔

ہندی زبان کے خالص حروف تہجی یا حروف ہجا یہ ہیں

ٹ، ڈ اور ژ

ان کے علاوہ دو آنکھ والی ہ سے ملنے والے حروف جن کو حروف صحیح بھی کہتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

بھ پھ تھ ٹھ جھ چھ دھ ڈھ ٹھ کھ گھ لھ مھ نھ
اس طرح ان کی تعداد کل ۱۴ ہے جب کہ پہلے ۱۱ حروف مخصوص ہیں مگر پروفیسر مسعود حسین خان نے لھ، مھ اور نھ ان میں اور درج کئے ہیں۔

اب ہندی زبان کے کل مخصوص حروف ۱۴ اور ۳ خالص حروف ہیں۔ ان کی تعداد کل ۱۷ ہو گئی۔

۲۸ عربی زبان میں مخصوص کل حروف:

فارسی زبان میں مخصوص حروف: ۴

ہندی زبان میں مخصوص حروف: ۱۷

اس طرح کل حروف تہجی یا حروف ہجا کی تعداد جو درج بالا تینوں زبانوں یعنی عربی زبان، فارسی زبان اور ہندی زبان سے مستعار لئے گئے وہ ۲۸ + ۴ + ۱۷ ہیں۔ ان کی کل تعداد ۴۹ ہے۔ یہ ۴۹ حروف تہجی یا حروف ہجا اردو زبان میں بولے اور لکھے جاتے ہیں اور اردو زبان ان ہی حروف تہجی یا حروف ہجا پر مشتمل ہے۔

نوٹ: یہاں یہ بات واضح رہے کہ ”ء“ کو ماہرین نے عربی زبان کے حروف تہجی یا حروف ہجا کی روایتی ترتیب سے خارج کر کے اعراب میں جگہ دی ہے اور لغت میں ”ء“ سے کوئی بھی لفظ نہیں بنتا ہے۔ جب کہ اس کی افادیت و اہمیت الگ سے ہے۔

چونکہ اردو زبان کی ابتداء ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے دہلی کے مضافاتی علاقوں میں ہوئی۔ ہندو اس زبان کو دیوناگری خط میں اور مسلمان اسے عربی و فارسی خط میں لکھتے ہیں۔

حروف تہجی یا حروف ہجا کی روایتی ترتیب کے بجائے اصل ترتیب کی سفارش حسب ذیل ہے:

۱۔ مدوالے حروف: ب پ ت ٹ ث ف

۲۔ مدور حروف یا دامن والے حروف: ج چ ح خ س ش ص ض ع غ ق ک گ ل ن ی

۳۔ کوزی حروف: د ڈ ذ ر ز ژ ثو

۴۔ عمودی حروف: (م ط ظ

۵۔ ایک آنکھ یادو آنکھ والا حرف: ھ

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ عاریت سے (Borrowing) کیا مراد ہے؟ دوسری زبان سے لینے کے عمل کو عاریت (Borrowing) اور دینے والی زبان کو دائن (Lender) کہا جاتا ہے اس طرح اردو زبان میں باقی زبانوں یعنی خاص کر عربی، فارسی اور ہندی زبانوں سے لئے گئے حروف تہجی کو عاریت کہتے ہیں اور جن زبانوں سے حروف لئے گئے ان زبانوں کو دائن (Lender) یعنی دینے والی زبانیں کہے جاتے ہیں۔

اردو ایک قومی زندہ زبان ہے اور اس زبان نے اپنے اندر دوسری زبانوں کے صحت مند اثرات ضم کر لئے ہیں۔ جب کہ اس کا آغاز ہی فارسی سے ہوا۔ بقول محمد حسین آزاد 'اردو کو پودا سنسکرت کی زمین سے اُگا اور فارسی کی ہوا سے سرسبز ہوا'۔ کچھ ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تہذیبی روایت اور تربیت کی بناء پر اپنی زبان یعنی اردو پر فارسی کا رنگ غالب رکھا اور کچھ نے اپنے کو عوام سے قریب رکھنے کی خاطر ہندی زبان کے الفاظ کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا۔

عربی کے بے شمار الفاظ اردو میں شامل ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے الفاظ بھی ہیں جنہیں دخیل الفاظ کہنا چاہیے۔ ان الفاظ کا عربی تلفظ اردو میں کچھ اور رہتا ہے یعنی اپنے اصل معنوں میں استعمال نہیں ہوتے ہیں۔ مثلاً وقت، فضل، صبر وغیرہ وغیرہ جہاں جہاں اس قسم کے الفاظ اردو میں آتے ہیں تو عربی سے ناواقفیت کی بناء پر اکثر اساتذہ صاحبان ان الفاظ کے تلفظ میں غلطیاں کرتے ہیں۔ اس لیے ان غلطیوں سے بچنے کے لیے اساتذہ صاحبان کو چاہیے کہ وہ عربی لغت سے رجوع کریں اور تصدیق کرنے کے بعد صحیح تلفظ کے ساتھ بچوں کو پڑھایا جائے۔

خوشی نویسی کے اوصاف

Quality of Good Handwriting

ہمارا دیس خوش نویسی میں ماضی کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل کر چکا ہے۔ یہاں کے خطاط اور خوش نویسوں کی فنکارانہ صلاحیتیں آج بھی ارباب ذوق سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہیں۔ چونکہ فن تحریر سیکھنے کے کچھ قواعد اور اصول مقرر ہیں ان میں بعض قواعد اور اصولوں کا ذکر یہاں لازمی بن جاتا ہے اور جن پر پابندی کے ساتھ کاربند رہنے کے بعد ہی ایک طالب علم خوش نویس بن سکتا ہے۔ وہ جو کہا گیا ہے ۔

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد
اگر خارے بود گلدستہ گردد

۔

ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا
وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا

ابتدائی جماعتوں میں لکھنا سکھانے کے طریقے

۱۔ لکھنے کے کام میں اُستاد کی توجہ شروع ہی سے بچوں کی صحیح تحریر اور مناسب رفتار پر رہنا چاہیے تاکہ آگے چل کر وہ نہ صرف خوش نویس بلکہ زود نویس کی صفت بھی اُن میں پیدا ہو جائے۔ دُرست ٹلنڈیک کے تحت لکھنا سکھانے کے لیے

استاد کے لیے یہ ضروری بن جاتا ہے کہ مسلسل مشاہدہ کے ذریعے وہ مختلف حروف کی شکلیں اور اُن کے جوڑ توڑ اور موڑ بچوں کے دل و دماغ پر پوری طرح نقش کر لے۔ اس لیے بچوں کی دلچسپی اور شوق کو ابھارنے کی خاطر لازم آتا ہے کہ لکھائی یا پڑھائی کا کام با معنی لفظوں اور جملوں سے شروع کرایا جائے۔ جملے اس قسم کے ہوں جو بچوں کی دلچسپی میں کچھ اضافہ کر سکیں اور جن میں الفاظ کی تعداد مناسب ہو۔ جملے سادہ اور عام فہم ہوں۔ ساتھ ہی جملے، الفاظ یا حروف چاک یا مار کر سے بورڈ پر لکھ کر بچوں سے ان کا بغور مشاہدہ کرایا جائے۔ جملوں، لفظوں اور حروف کے مختلف چھوٹے چھوٹے کتبے جلی حروف میں لکھ کر یا گتے اور ایک ریگ منال سے حروف کاٹ کر مناسب مقامات پر رکھے جائیں تاکہ بچے وقتاً فوقتاً اُن کو دیکھیں۔ مناسب موقع پر انہیں ان کتبوں کے الفاظ اور حروف پر اُنکی پھیرنے کی مسلسل مشقیں دی جائیں تاکہ اُن کی عضلاتی اور اعصابی حرکات میں توازن پیدا ہو سکے اور ہاتھ اور اُنکلیوں کے اعصاب تربیت پاسکیں۔

۲۔ کارڈ بورڈ سے حروف کاٹ کر الگ کئے جائیں اور طلباء سے کہا جائے کہ حروف کی نالیوں میں اُنکی پھیریں۔

۳۔ زمین پر چونے یا گیرو سے حروف لکھے جائیں بچوں کی مدد سے ان حروف میں نالیاں کھودی جائیں۔ پھر کھودے ہوئے حروف کی نالیوں میں مناسب انداز سے پانی ڈال دیا جائے اور بچوں سے کہا جائے کہ وہ ان نالیوں میں اُنکی پھیریں۔

۴۔ اُستاد ہوا میں اُنکی سے حروف و الفاظ لکھنا بچوں کو سکھائے اور ان سے یہ عمل

عمل آ نکھیں بند کر کے کرایا

جائے۔ تاکہ ان کے ذہن پر حروف و الفاظ کی شکلیں پوری طرح نقش ہو جائیں۔

۵۔ مختلف قسم کی رنگدار چیزوں یا کنکریوں سے مینڈھیں بنانا کر مختلف حروف بنوائے جائیں اور لفظوں کے ہیر پھیر اور تبدیلیوں سے حروف کا نام تبدیل کرنے کا گر سکھایا جائے اور اس طرح معمولی ہیر پھیر سے ہم شکل لفظوں کا مفہوم بدل کر رکھ دینا کھیل کھیل کے طریقے میں انہیں سمجھایا جائے اور تیلیوں یا شاخوں کے قلم سے مٹی یا ریت پر سیکھے ہوئے حروف اور الفاظ لکھنے کی مشقیں دی جائیں اور فرش پر باریک مٹی اور ریت سلیقے کے ساتھ الگ الگ پھیلا دی جائے اور بچوں سے کہا جائے کہ وہ اس پر تیلیوں یا شاخوں کے قلم سے نمونے کے مطابق حروف یا الفاظ لکھیں (اُستاد خود قلم بنانا جانتا ہو)۔ جب بچے لکھنے میں مشغول ہوں تو مدرس ہر بچے کے پاس جائے، بیٹھے اور دیکھے کہ آیا قلم کی گرفت اور بچے کی نشست ٹھیک ہے۔ وہ ہاتھ پکڑ کر بچے کو قلم پکڑنا سکھائے۔ حروف کے جوڑ توڑ اور موڑ، قد، دامن اور دوسری باتوں کو عملی طور پر بچوں کے ذہن نشین کر لیا جائے۔ لکھاتے وقت بچوں کی نشست کا خاص طور پر خیال رکھنا اُستاد کے لیے ناگزیر بن جاتا ہے تاکہ ان کی صحت اور بصارت پر کسی قسم کا بُرا اثر نہ پڑے۔ اس سلسلے میں اُستاد ہمیشہ یہ احتیاط پیش نظر رکھے۔

(۱) بچے لکھتے وقت آگے جھک نہ جائیں (۲) ان کی چھاتی میں خم نہ آجائے (۳) وہ لیٹ کر یا نانگلیں پھیلا کر لکھنے کے عادی نہ ہو جائیں (۴) تختی یا نوٹ بک آنکھوں سے بہت دور یا بہت نزدیک نہ رکھی جائے۔ اس کے لیے تقریباً ایک فٹ کا فاصلہ موزون ہے۔

زمین پر بیٹھنے والے بچوں کے لیے مناسب ہے کہ وہ ایک گھٹنا ٹک کر اور

دوسرے گھٹنے پر تختی یا نوٹ بک رکھ کر لکھیں چونکہ لکھنا بجائے خود ایک ایسا با مقصد مگر پیچیدہ عمل ہے جس میں آنکھ ہاتھ اور دماغ تینوں باہم مل کر بیک وقت کام کرتے ہیں۔ مگر قوت باصرہ کو ان میں خاص اہمیت حاصل ہے جس کے طفیل حروف اور الفاظ کی شکلیں بچے کے دماغ پر نقش ہو جاتی ہیں۔ اس لیے اُستاد زبان کو چاہیے کہ ابتداء میں بچوں کو ٹھہر ٹھہر کر اور سنبھل سنبھل کر لکھنا سکھائے۔ کاغذ لکیر دار استعمال کرایا جائے تاکہ بچے سیدھی سطروں میں لکھ سکیں اور حروف و الفاظ کا دامن ہم سطح رکھ سکیں۔ اس طرح پیہم اور مسلسل محنت سے ایک مبتدی کسی بھی مضمون یا فن میں پوری مہارت اور کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ چونکہ خوشخط لکھنا ایک فن ہے جس کے سیکھنے میں مسلسل مشق و محنت کی ضرورت ہے۔ فارسی زبان کے ایک شاعر نے خوش نویسی بننے کا ایک آسان سا طریقہ سادہ الفاظ کے ساتھ اس شعر میں یوں بنا دیا ہے۔

گر تو مے خواہی کہ باشی خوش نو پس
مے نو پس و مے نو پس و مے نو پس
خوش نویسی کی تعلیم کے لیے بہترین اصول یہ ہے کہ آسان سے مشکل کی طرف اور مفرد سے مرکب کی طرف چلیں۔ اس لیے پہلے مفرد حروف تہجی کی مشق کرائی جائے۔ مناسب یہ ہے کہ جملہ حروف کو گروہوں میں تقسیم کر لیا جائے۔ ہر گروہ میں ایسے حروف شامل کئے جائیں جو صورت میں بالکل ملتے جلتے ہوں۔ ہر گروہ میں سے پہلے ایک حرف کی مشق کرائی جائے اس کے بعد دوسرے حرف کی مشق کرانے میں آسانی ہوتی ہے۔ حروف کی گروہ بندی یا تقسیم حسب ذیل طریقے پر کی جائے تو اچھی خاصی مشق ہو جاتی ہے۔ ابتداء لفظوں کی مشق کرائی جائے۔ نقطے مرابع بھی ہوتے ہیں اور مدور بھی۔

بعد میں مد والے حروف کی مشق کرائی جائے جیسے ب پ ت ث ٹ
اسی طرح دامن والے حروف کی مشق کرائی جائے جیسے ج چ خ س ش ص
ض ع غ ق ک گ ل ن ی

اسی طرح کوڑی حروف کی مشق کرائی جائے جیسے ذ ڈ ر ز ژ ٹو
اسی طرح عمودی حروف کی مشق کرائی جائے جیسے ل م
منقوٹ اور غیر منقوٹ حروف کی پہچان کر کے ان کی مشق کرائی جائے۔ بعد
میں متفق حروف جیسے ط، ظ، ہ

اس طریقے سے بچے لکھنے میں مہارت حاصل کرنے کے قابل بن سکتے ہیں
اور آسانی بھی ہو جاتی ہے اور بچوں میں خوش نویسی کا فن پیدا ہونے کا امکان ہے۔
جب حروف مفرد کی بخوبی مشق ہو جائے تب مرکبات کی مشق کروائی جائے۔
اس سلسلے میں طلبہ کو یہ بات ذہن نشین کی جائے کہ مرکبات یعنی ایک حرف کے
دوسرے حرفوں سے ملنے یا ترکیب پانے کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔

(۱) ترکیب سابق (۲) ترکیب لاحق (۳) ترکیب طرفین

ترکیب سابق: جب کوئی حرف ایک کلمے میں اپنے سے پہلے حرف
سے ملا کر لکھا جاتا ہے تو اسے ترکیب سابق کہتے ہیں۔ جیسے لفظ ”با“ میں (ا) سے پہلے
ب ملا یا گیا۔

ترکیب لاحق: جب کوئی حرف ایک کلمے میں حرف مابعد سے ملا کر لکھا
جائے تو اسے ترکیب لاحق کہتے ہیں جیسے ”تب“ لفظ میں سابق کے مابعد ”ب“
لکھا گیا۔

ترکیب طرفین: جب کوئی حرف اپنے ماقبل اور مابعد حرف سے
ملا کر لکھا جائے تو اسے ترکیب طرفین کہتے ہیں۔ جیسے لفظ ”مشق“ میں حرف ”ش“

درمیان میں لکھا گیا۔ اس لفظ کا سابقہ حرف م اور لاحقہ حرف ”ق“ ہے۔
بعد میں ترکیب سابق و لاحق و طرفین کی مشق کرائی جائے اور الفاظ دو حرفی،
سہ حرفی، چار حرفی، نہج حرفی وغیرہ کی مشق کرائی جائے۔
اگر طلبہ ان مرکبات کی خاطر خواہ مشق کریں تو فن خوش نویسی میں مہارت تام
حاصل ہو سکتی ہے۔

لکھنے کی مہارت میں خامیاں اور اُن کی بہتری کے لیے اصلاح

Defects in Writing Skills and Their Improvement

اردو زبان چونکہ ایک مخلوط زبان ہے۔ اس زبان میں مختلف زبانوں کے حروف و الفاظ شامل ہیں۔ خاص کر یہ زبان عربی زبان، فارسی زبان اور ہندی زبان سے مل کر پیدا ہوئی اور اس کی ابتداء کے بارے میں مختلف نظریات بتائے گئے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ زبان ایک نئی زبان بن گئی۔ چونکہ اس کا رسم الخط فارسی زبان کا رسم الخط ہے جو کہ اعراب سے بالکل مبرا ہے۔ اس لیے اس کے لکھنے میں جو مشکلات اور مسائل پیدا ہوتے ہیں وہ اسی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ نیز اس زبان میں حروف بھی مستعار لئے گئے ہیں اس لیے ان کے لکھنے اور پڑھنے میں دقت آتی ہے۔ خاص کر ہم صوت حروف و الفاظ پڑھتے وقت اور لکھتے وقت بچوں میں ابہام اور شک و شبہات پیدا ہوتے ہیں جس سے اُن کے پڑھنے اور لکھنے میں نقص پیدا ہو کر ان کے ذہن اچھی طرح سے سمجھتے نہیں۔ چونکہ اُردو میں چند حروف ایسے ہیں جو صوتی اعتبار سے ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔

جیسے ش س ص ت ط ق، غ گ
 ذ ظ ض وغیرہ ع

اس صوتی مشابہت کی وجہ سے بچوں میں بے یقینی پیدا ہو جاتی ہے اور جب

لکھنے کا وقت آتا ہے تو اکثر غلط لکھتے ہیں۔ اس لیے جب تک متذکرہ حروف اور ایسے الفاظ کی جن میں یہ حروف موجود ہیں پوری شناخت اور اُن کے تلفظ میں اُنہیں خاص مشق نہ دی جائے شک یا ابہام کا رفع ہونا مشکل ہے۔ اور ایسی صورت میں ان کی تحریر کا غلطیوں سے پاک رہنا بھی مشکل ہوگا۔ غرض ابتدائی درجوں کے بچوں کے لیے لکھنے کی مشق کو ایک باقاعدگی کے ساتھ جاری رکھنا ہر حال میں ناگزیر ہے اور ایسی مشق جس میں تسلسل بھی ہو اور جو بچوں کے لیے بامقصد بھی ہو وہ تحریر اور املانویسی یا نقل نویسی ہی کے ذریعے دی جاسکتی ہے۔ چونکہ بچے کا ہاتھ لکھتا ہے، آنکھ دیکھتی ہے مگر دماغ ساتھ ساتھ سوچتا ہے اور الفاظ اور فقرہوں کا مفہوم بھی معلوم کرتا جاتا ہے۔

اُردو اور ہندی کے الفاظ کی تحریر اور تلفظ میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ کوئی حرف ایسا ہے جو لکھا تو جاتا ہے لیکن اس کا تلفظ نہیں ہوتا۔ مثلاً ”خود“ واؤ معدولہ۔ کہیں ایک حرف دوسرے کی آواز دیتا ہے جیسا کہ ”عیسیٰ“ میں یا ئے مقصودہ یا ”زکوٰۃ“ میں واو سے (الف) کی آواز صادر ہوتی ہے۔ اس میں یہ مشکلات بچوں کو لکھنے اور پڑھنے میں درپیش آتی ہیں اور اس قسم کے نقائص بچوں میں لکھتے وقت سامنے آتے ہیں۔ مدرس کا فرض ہے کہ وہ ان نقائص کا ازالہ کرے اور بچوں میں اصلاحی تدریس کی تربیت پیدا کرے۔ بشرطیکہ مدرس خود لکھنے کی مہارت رکھتا ہو اور پڑھنے میں بھی جانکاری رکھتا ہو۔

لکھنے کی مہارتوں میں خامیوں کی اصلاح (Improvement)

چونکہ یہ پہلے ہی کہا گیا ہے کہ لکھنا ایک فن ہے اس کو فنِ تحریر بھی کہتے ہیں۔ بچوں کو کوئی بھی عبارت تحریر کرتے وقت جو خامیاں یا مشکلات پیش آتے ہیں اُن کا ذکر تو ہو چکا اب خامیوں کی اصلاح ضروری ہے ورنہ یہ خامیاں ان میں تاریخ

اتحصول ہونے کے بعد بھی موجود رہیں گے۔

۱۔ فرض شناس مدرس یہ کوشش کرے کہ وہ بچوں سے جو کچھ لکھوائیں۔ خوبصورت اور خوشخط لکھوائیں۔ وہ پہلے بورڈ پر اپنے ہاتھ سے حروف و الفاظ خوشخط انداز میں یعنی کہ جو کچھ لکھوانا ہو اُن کی صحیح شکل و صورت بچوں کو سکھائے کیونکہ بچے اپنے قوتِ باصرہ سے ایسا سب کچھ اپنے دماغ پر نقش کھینچتا ہے۔ اور اُس کے تمام قویٰ ہم آہنگ ہو کر اس طرح کام کرتے ہیں کہ الفاظ کی صحیح شکل خود بخود بچے کے دل نشین ہو جاتے ہیں۔

۲۔ نقل کرتے وقت بچوں کو غور و خوض سے الفاظ اور عبارت کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ جس سے الفاظ کی صحیح بناوٹ اور ترکیب اور عبارت کا سیاق و سباق اُن کے ذہن نشین ہو جاتا ہے اور یوں قوایِ ذہنی کی پوری تربیت ہو جاتی ہے۔

۳۔ بچوں میں صحیح لکھنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے اور اس عادت کی بدولت بچے کا ہاتھ لفظوں کی صحیح شکل بنانے میں اتنا مشاق ہو جاتا ہے کہ زندگی میں پھر کبھی کسی لفظ کے صحیح لکھنے میں غلطی نہیں کرتا۔ خواہ لکھنے کی رفتار کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو۔

۴۔ اُستاد ہر بچے کی نوٹ بک خود درست کر لے اور بچوں کو غلط لکھنے اور غلطیاں کرنے سے بچاتا رہے۔

۵۔ مدرس جملہ یا عبارت ایک بار اور بشرطِ ضرورت دوبار معتدل آواز میں پڑھے اور بچوں کو ضبط اور خاموشی سے لکھنے کی ہدایت کرے۔

۶۔ جملوں یا عبارت کی علامتوں مثلاً وقفہ، واوین، علامت سوالیہ، علامت ندائیہ اور اس قسم کی دوسری علامتوں کو ظاہر کر کے اور اُن کو اپنی جگہ پر لکھنے کی مشق دی جائے۔

۷۔ معینہ عبارت کے لکھانے کے بعد پھر ایک بار یعنی آخری بار لڑکوں کو سنادی جائے تاکہ وہ اپنی اپنی نوٹ بکوں کو دیکھ کر سُنی اور لکھی ہوئی عبارت کا مقابلہ کر سکیں۔ بچوں کو وقت دیا جائے کہ وہ الفاظ یا علامتیں وغیرہ جو لکھنے سے رہ گئی ہوں، لکھ ڈالیں۔

۸۔ بچوں کو معینہ عبارت دیکھنے اور پڑھنے کا پورا موقع دیا جائے۔ ورنہ بچوں کی قوتِ حافظہ یا دوسری ذہنی قوتیں اپنے فرائض کو سرگرمی سے انجام دینا یا کم دیں گی یا بالکل چھوڑ دیں گی۔

مندرجہ بالا اصلاحات کے پیش نظر ایک اچھا مدرس بچوں میں لکھنے کی خامیاں دور کر سکتا ہے۔

مضمون نویسی

(Essay Writing)

مضمون نویسی ایک فن ہے جس کے لیے کوشش اور مشق کی ضرورت ہے۔ اگر ادبی اور علمی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو لکھنے کی مشق اور اس میں کمال حاصل کرنا ہمارا خاص کر مدرس کا مقدس فریضہ ہے۔ اردو ادب کا عہد ماضی ہر اہل اُردو کو دعوتِ فکر دیتا ہے اور اس کے متعلق لکھنے کا سبق دیتا ہے۔ اُس وقت جب کتابت اور اشاعت و طباعت کی کوئی سہولیت موجود نہیں تھی پھر بھی اسلاف لکھتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو زبان ہندوستان کی جملہ زبانوں میں اپنے کثیر التعداد اور بیش بہا اور قدیم ترین ادبی خزانوں کی وجہ سے ممتاز بن گیا۔

عنوان کے انتخاب میں طلبہ کی دلچسپی کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اور مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا لازمی ہے۔

۱۔ ابتداء میں صرف اُن عنوانات پر انشاء کا کام کرایا جس کے متعلق تجربات و مشاہدات کے کافی مواقع ہوں اور طلبہ کے ذہن میں پہلے سے اُن کا مواد موجود ہو۔

۲۔ مضمون نویسی کا کام مناسب مقدار اور مناسب وقفے سے دیا جائے۔

۳۔ مضمون نویسی کے مثالی نمونے بھی دکھائے جائیں۔

- ۴۔ عبارت میں ربط اور اظہار خیال میں نظم و ترتیب کا لحاظ رکھا جائے۔
- ۵۔ عنوان سے متعلق بہت سی باتیں لکھنے کی طرف توجہ دی جائے۔
- ۶۔ ابتدائی درجوں میں خالی جگہیں پُر کرنا۔ الفاظ جملوں میں استعمال کرنے اور عنوانات پر چند مربوط جملے لکھنا سکھائیں اور رفتہ رفتہ مربوط عبارتیں اور مکمل مضامین لکھوائے جائیں۔
- ۷۔ تحریری کام کی بروقت اصلاح کی جائے۔ بھونڈی غلطیاں پہلے لی جائیں اور معمولی بعد میں۔
- ۸۔ غلطیاں زیادہ ہوں تو دوبارہ لکھوایا جائے۔
- ۹۔ اچھے مضمون پر شاباشی دی جائے۔

مضمون نویسی میں مہارت پیدا کرنے کے لیے ہدایات

- ۱۔ مضمون لکھنے سے پہلے موضوع پر خوب غور کرنا چاہیے اور طلبہ سے موضوع پر مواد پیش کرنے کی صلاحیت دیکھی جائے
- ۲۔ خیالات کی ترتیب صحیح ہو۔
- ۳۔ زبان صاف اور سُستہ ہو۔
- ۴۔ ایک پریگراف میں صرف ایک خیال پیش کیا جائے۔
- ۵۔ املا کا خاص خیال رکھنا چاہیے مثلاً ”ث“ کے بجائے س یا ص یا س یا ص کے بجائے ٹ، ط کے بجائے ت یا ت کے بجائے ط، ک کے بجائے ق یا ق کے بجائے ک، غ کے بجائے گ یا گ کے بجائے غ وغیرہ کا استعمال نہ کیا جائے۔
- ۶۔ رموز و اوقاف کی علامتیں دُرست ہوں۔
- ۷۔ ایک ہی خیال بار بار نہ دہرایا جائے۔

۸۔ اپنا علم اور واقفیت بڑھانے کے لیے کثرت سے کتابوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ اچھے مقررروں کی تقریریں سنا کرے اور غور و خوض سے لکھنے کی خوب مشق کرے۔

مضامین کی قسمیں

عام پر مضامین کی تین قسمیں ہیں

(۱) بیانیہ (۲) تاریخی (۳) تخلیہ

(۱) بیانیہ: اس قسم کے مضامین میں کسی چیز، مقام، کھیل، سفر، شخص، حیوان یا کیفیت وغیرہ کی تفصیلات بیان کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے مضامین کو مقرونیہ مضامین بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اُستاد مقرون یا تصاویر یا ماڈل وغیرہ پیش کر کے ابتدائی جماعتوں میں ایسے مضامین لکھوا سکتے ہیں۔ اس قسم کے مضامین پر انٹرمی کلاسوں میں آس پاس یا ماحول سے پیش کردہ مقرون اشیاء دکھا کر بچوں سے معلوم سے نامعلوم کی طرف لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر کلاس میں اگر ہم ”گائے“ پر مضمون لکھوانا چاہئیں، اگرچہ اصلی صورت میں گائے کلاس میں نہ لاسکتے ہیں تو گائے کی تصویر بچوں کو تصویر کا مشاہدہ کرا کے اس حیوان پر مضمون لکھوا سکتے ہیں۔ اسی لیے اس قسم کے مضامین کو بیانیہ مضامین یا مقرونیہ مضامین کہتے ہیں۔ اس طرح اس قسم کے مضامین ہم پر انٹرمی کلاسوں تک ہی محدود رکھ سکتے ہیں۔

(۲) تاریخی: اس قسم کے مضامین میں تاریخی واقعات، تاریخی عمارتیں، نامور ہستیوں اور بادشاہوں وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے۔ اس قسم کے مضامین وسطانوی کلاسوں یا ثانوی کلاسوں میں لکھوائے جاتے ہیں جیسے تاج محل، جامع مسجد، میرا

پسندیدہ لیڈر یا شاعر وغیرہ جیسے مضامین لکھوا سکتے ہیں۔ چونکہ طلباء کا ذہن اس سطح پر پُرانمری سطح سے اوپر ہوتا ہے اس لیے ذہن کا خیال رکھتے ہوئے مضامین طلبہ سے لکھوائے جاسکتے ہیں۔ بشرطیکہ مدرس خود تربیت یافتہ اور تجربہ کار ہو، تاکہ بچوں کو فائدہ ملے۔ نیز تاریخی مضامین لکھنے والے مضامین نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ تاریخ سے واقف ہو۔

(۳) تخلیہ: تخلیہ مضامین کو فکر یہ مضامین بھی کہتے ہیں۔ اس قسم کے مضامین میں کسی مسئلہ اصول، کیفیت وغیرہ پر بحث ہوتی ہے۔ چونکہ تخلیہ یا فکریہ مضمون لکھنا مشکل کام ہے۔ اس قسم کے مضامین میں کسی نہ کسی اہم مسئلہ پر بحث ہوتی ہے۔ مثال کے طور ”بیروزگاری کا مسئلہ“، جہیز کا مسئلہ وغیرہ اس قسم کے مضامین ثانوی، اعلیٰ، ثانوی اور فوقانی درجوں میں لکھوائے جاتے ہیں۔ کیونکہ طلبہ کا ذہن اس سطح پر اس قابل ہوتا ہے کہ وہ سوچ سمجھ سے کام لیتے ہیں اور فکر کر کے اپنے دماغ اور ذہن سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اس قسم کے مضامین کو حکائیہ مضامین بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ بچے یا طلبہ اس قابل ہوتے ہیں کہ وہ اپنا قوت تخیل بڑھا کر اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ ایسا مدرس کی راہنمائی میں فائدہ مند رہتا ہے۔ بشرطیکہ مدرس خود قوت تخیل، قوت فکر اور قوت ادراک رکھتا ہو۔ ہر حال میں مدرس کی راہنمائی لازمی ہے۔

مضامین کے احراء

ہر قسم کا مضمون تین حصوں پر مشتمل ہوتا ہے

(۱) تمہید (۲) نفس مضمون (۳) خاتمہ

تمہید: اچھی تمہید لکھنا ایک آرٹ ہے۔ اس کا دار و مدار لکھنے والے کے حسن

طبع اور ذوق سلیم پر ہے۔ اس آرٹ کو طلبہ میں پیدا کرنے کا شوق و ذوق ایک قابل اور با ذوق استاد ہی پیدا کر سکتا ہے۔ مضمون کی تمہید پُر اثر انداز میس ہونی چاہیے کیونکہ تمہید کی وجہ سے پورا مضمون پڑھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مضمون نگار کسی ایسے فقرہ یا شعر کو ابتداء بنائے جس کو پڑھتے ہی قاری خوش ہو جائے اور مضمون نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ جو مضمون لکھے تو اس موضوع پر پہلے وہ خود حاوی ہو۔

نفسِ مضمون: نفسِ مضمون کو متن بھی کہتے ہیں۔ نفسِ مضمون میں ہی خیالات اظہار کئے جاتے ہیں اور اس میں مضمون کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جاتی ہے۔ اس میں مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ اور تخیل سبھی سے کام لیا جاتا ہے۔ ہر مستقل خیال اور جداگانہ نکتوں کے بیان کے لیے الگ الگ پر یگراف (اقتباسات) وقف کئے جاتے ہیں۔ پیر یگراف الگ الگ ہوں تاکہ خیالات خلط ملط نہ ہو جائیں اور پڑھنے والا مضمون آسانی سے سمجھے۔ اس حصہ میں لازم ہوتا ہے۔ مضمون نگار روزمرہ محاورے، استعارات اور تشبیہات وغیرہ سے کام لے کر مضمون کی اہمیت کو چار چاند لگائے۔ اور پڑھنے والوں کے ذہنوں پر اپنی قابلیت کی مہر ثبت کرے۔ نیز مضمون نگار کا خط اچھا ہو وہ خوش نویس بھی ہو۔ لکھتے وقت سطور کا خیال رکھا ہو ایسا نہ ہو تو سطریں ٹیڑھی بنا کر لکھے۔ املا وغیرہ کا خیال رکھے۔ غرض کہ نفسِ مضمون ہی مضمون کا دل ہوتا ہے، اس کا خاص خیال رکھنا ضروری ہو تاکہ مضمون کی خوبصورتی میں کسی قسم کی خرابی پیدا نہ ہو۔

خاتمہ: تمہید کی طرح یہ مرحلہ بھی دلکش، مؤثر اور معنی خیز ہونا چاہیے۔ اس حصہ میں مضمون کے تمام پہلوؤں کا خلاصہ مختصر مگر جامع اور پُر زور الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔ خشک تبصروں اور بے مزہ نصیحتوں سے پرہیز کرنا ضروری ہے اور

ایسے الفاظ سوچے جائیں جو موقع کے لحاظ سے مناسب ہوں۔ بے مزہ نتائج اور نصائح سے پرہیز کیا جائے۔ موجودہ تعلیمی نظام میں مدرس تحتانوی درجوں سے ہی طلبہ میں بات چیت کی مہارت پیدا کرتا ہے۔ اور دوران بات چیت مدرس طلبہ کی غلطیوں کی دُستی زبانی یا تحریری طور پر کرنا شروع کرتا ہے تاکہ طلبہ کو مضمون نگاری میں مدد ملے۔

اچھا مضمون نگار بننے یا بنانے کے لیے ذیل کی باتیں ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔

۱۔ تلفظ صحیح اور صاف ہو۔

۲۔ جلدی سے کام نہ لیا جائے۔

۳۔ گرائمر کے اعتبار سے جملے صحیح ہوں۔

۴۔ خیالات میں ترتیب ہو۔

۵۔ قلم موزون ہو یعنی کہ فنِ تحریر قابلِ فہم ہو اور خوشخط ہو۔

پرائمری جماعتوں میں گفتگو اور تقریر کے لیے مندرجہ ذیل موضوعات ہو سکتے ہیں۔

جماعت اول: سیب، بلی، کو، وغیرہ

جماعت دوم: مقامات، کسی تصویر پر گفتگو۔

جماعت سوم: کتاب، قلم، کاغذ وغیرہ۔

جماعت چہارم: درسی کتاب سے کسی پڑھی ہوئی کہانی یا مضمون پر گفتگو کرائی جائے۔

جماعت پنجم: مختلف تقاریب مثلاً یومِ آزادی، عید، دیوالی پر۔

اس کے لیے مدرس میں ان اوصاف کا ہونا لازمی ہے (۱) آواز موزون ہو

(۲) چھوٹوں سے شفقت بڑوں سے ادب اور ہم عمر سے دوستی اور محبت۔ نیز مدرس کو چاہیے کہ وہ طلبہ سے غصہ میں چلانے، سخت دست کہنے اور بدزبانی کی عادتیں چھڑائی جائیں۔

اسی طرح بڑی جماعتوں یعنی (وسطانوی، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی) میں مضمون نگاری کروائی جاسکتی ہے لیکن اس بات کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے کہ مضمون اور خیالات کی مقدار کا تعلق مضمون نگار کی عمر، علمی استعداد، معلومات اور حافظہ سے ہے ہائی سکول کے طلبہ کے لیے شاعر کی زندگی، محبوب لیڈر، سڑک کا حادثہ، کوئی سماجی مسئلہ وغیرہ وغیرہ لکھوائے جاسکتے ہیں۔

مطالعہ کے اصول

(Principles of Study)

- ۱۔ مطالعہ کا ایک مقصد ہونا چاہیے۔ بغیر مقصد کے کوئی مطالعہ معتبر نہیں ہو سکتا۔
- ۲۔ طلبہ جب پڑھنے کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کو مطالعہ میں مصروف رکھا جائے تاکہ وہ تعلیمی مقصد حاصل کر سکیں۔
- ۳۔ مطالعہ میں طلبہ کی دشواریوں کو دور کیا جائے۔
- ۴۔ مطالعہ کا وقت مناسب رکھا جائے تاکہ طلباء میں دلچسپی پیدا ہو۔
- ۵۔ مطالعہ کا کام دینے سے پہلے اس کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ مطالعہ جب ہی مفید ہوگا جب اس کی تشریح و توضیح کر دی جائے گی۔
- ۶۔ مطالعہ کے لیے ماحول بنانا بھی ضروری ہے۔
- ۷۔ مطالعہ کا خلاصہ تیار کیا جائے۔
- ۸۔ جماعت میں طلبہ کے مطالعہ کی نگرانی ضروری ہے۔
- ۹۔ مطالعہ طلباء کی سابقہ معلومات اور ان کی روزمرہ زندگی سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔
- ۱۰۔ مطالعہ کی ایک فہرست تیار کی جائے اور طلبہ کو ایک کے بعد دوسری کتاب دی جائے۔

۱۱۔ مطالعہ کی عادت کی تشکیل کے مواقع فراہم کئے جائیں اور ان کو دلچسپ کام کرنے کو دئے جائیں۔

۱۲۔ مطالعہ کردہ مواد کو تحریر میں لانا چاہیے۔ صرف حافظہ پر بھروسہ نہ کیا جائے۔

۱۳۔ مطالعہ کے دوران ماحول موزون ہو۔

درج بالا اصول مد نظر رکھتے ہوئے دوران مطالعہ مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ دوران مطالعہ روشنی کی شعاعیں بائیں جانب سے پڑیں اور روشنی نہ زیادہ تیز نہ زیادہ مدہم ہو کیونکہ ایسا ہونے سے آنکھوں کی بینائی اثر انداز ہو جاتی ہے۔

۲۔ کرسی یا بینچ پر بیٹھ کر پڑھتے وقت دونوں پیرزین پر رکھے جائیں۔

۳۔ دوران مطالعہ سیدھا بیٹھا جائے ورنہ ریڑھ کی ہڈی یا کمر ٹیڑھا ہونے کا امکان ہے۔

۴۔ ضرورت کی کتابیں اور اشیاء میسر ہوں تو ذہن اچھی طرح کام کرتا ہے۔

۵۔ آنکھ اور کتاب کے درمیان کم از کم پچاس سنٹی منٹر کا فاصلہ ہونا چاہیے۔ اس سے ایک ساتھ زیادہ الفاظ نظر کی زد میں آتے ہیں۔

۶۔ مطالعہ کے دوران تمام ذہنی پریشانیاں ایک طرف چھوڑی جائیں اور ذہن کو مطالعہ کے لیے تیار کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ دوران مطالعہ توجہ ٹھکنے نہ پائے اور پوری توجہ مرکوز مطالعہ کیا جائے۔

مطالعہ کی اہمیت و افادیت

طالب علم، علم سیکھنے والا ہوتا ہے۔ وہ تعلیم حاصل کرتا ہے۔ تعلیم کسی چیز کی آگاہی یا واقفیت کا نام ہے۔ تعلیم کا مقصد بھی طلبہ کی مخفی صلاحیتوں کا اجاگر کرنا ہوتا

ہے۔ طالب علم ہمیشہ علم کا خواہاں ہوتا ہے۔ اسے تعلیم کی طرف توجہ کرنا بہت ضروری ہے۔ اس لیے طالب علموں کا اس جانب توجہ کرنا اشد ضروری ہے۔ جب ان میں تعلیمی معیار بلند ہوگا۔ اس کے لیے طلبہ کے تعلیمی معیار کی بلندی میں مطالعہ بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔

مطالعہ یعنی کسی چیز کو دیکھنا اُس سے واقفیت پیدا کرنے کے واسطے مطالعہ کرنا یا کتب بینی کے عمل کو مطالعہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ سرپرست حضرات اور اساتذہ کا طلبہ میں مطالعہ کی عادات کو پروان چڑھانا بہت ہی ضروری ہے۔ طلبہ میں اچھی عادات و اطوار کو فروغ دیں اور مطالعہ کی اچھی عادتوں کو فروغ دینے کے لیے مندرجہ ذیل نکات پر توجہ دینا ضروری ہے۔

- ۱۔ کسی بھی کام میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اُس کی منصوبہ بندی ضروری ہے۔ ایک ماہر نفسیات کے مطابق کسی بھی عمر کا طالب علم جو اپنے روزانہ کے کام کا منصوبہ بناتا ہے، مطالعہ کو ترتیب اور سلیقہ مندی سے کرنے کے لیے صاف غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے آزادی سے کام کرنے دیں۔
- ۲۔ مطالعہ کی اچھی عادات کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ طلباء میں مطالعہ کی لیاقت پیدا ہو۔ یہ جب ہی ممکن ہے جب وہ کچھ مطالعہ کریں۔ اس کو فہم و فکر کے ساتھ پڑھیں۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سوال کو صحیح سمجھنے لگیں اور اس کے لیے صحیح جواب فراہم کر سکیں۔ ایک ماہر نفسیات نے صحیح کہا ہے کہ سوالات کے جوابات کی تشکیل کر کے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ حقیقت میں اس علم سے زیادہ وقت تک یاد رہتا ہے۔ جس کو مطالعہ کی کوششوں کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

کیونکہ بہت زیادہ مواد کو یاد رکھنا ممکن نہیں۔ مختصر نویسی سے غور و فکر کرنا اور زیادہ یاد کرنے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ چنانچہ طلبہ کی ضرورتوں کا ہوشیاری سے تشخیصی مطالعہ کیا جانا چاہیے اور انفرادی مطالعہ کو فروغ دیا جائے اور تابع وقت مطالعہ کا خیال رکھا جائے تاکہ مطالعہ اور وقت دونوں کا احساس ہو۔

۴۔ ساتھ ہی طلبہ میں خاموش مطالعہ کی بھی عادات پیدا کی جائیں۔ اس کے لیے جگہ اور وقت طے شدہ ہونا چاہیے تاکہ مطالعہ صحیح طور کیا جائے۔

بقول ماہر نفسیات رسک طالب علم کی لیاقت اس کے مطالعہ کو متاثر کرتی ہے۔

اس لیے ان نکات پر اہمیت دینا ضروری ہے۔

۱۔ اچھی طرح پڑھنے کی لیاقت۔

۲۔ لغت استعمال کرنے کی لیاقت۔

۳۔ کتب خانے کی کتابوں کو استعمال کرنے کی لیاقت۔

۴۔ مختصر نویسی کی لیاقت۔

۵۔ مطالعہ پر توجہ مرکوز کرنے کی لیاقت۔

۶۔ کتب خانہ جانے کی عادت۔

۷۔ کتابیں پڑھنے کا شوق۔

ان امکانات سے طلبہ میں مطالعہ کا شوق پیدا ہوگا جس سے ہمہ جہتی ترقی پیدا ہو سکتی ہے۔ انگریزی مفکرین نے صحیح کہا ہے کہ مطالعہ سے خلوت میں خوشی، تقریر میں آراستگی، تجویز و ترتیب میں استعداد اور تجربہ میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ابراہیم لنکن نے مطالعہ کے بارے میں کیا خوب لکھا ہے: ”کتابوں کا مطالعہ دماغ کو روشن کرتا ہے“ بالکل صحیح ہے۔

واقعی مطالعہ انسان کو ذی علم اور وسیع النظر بناتا ہے۔ مطالعہ سے انسانی دل و

دماغ کے درتچے روشن ہوتے ہیں۔ انسانی شعور، قوتِ ادراک، قوتِ مستحیلہ میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مضمون میں ملٹن کا قول نقل کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

”عمدہ کتاب حیات ہی نہیں بلکہ ایک لافانی چیز ہے۔ عمدہ کتابوں نے انسانوں کے اخلاق اور طبائع پر اثر ڈالا ہے۔ قوموں میں ہلچل اور انقلاب برپا کئے ہیں اور ملکوں کی کایا پلٹ میں حیرت انگیز مدد دی ہے۔“ چنانچہ ڈیوس اس بات کی تائید کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”اعلیٰ ترین اور بلند ترین چیزوں سے مراد اچھی کتابیں ہیں جو انسانی زندگی میں مشعل راہ ہو سکتی ہیں۔“

مختصر یہ کہ انسانی زندگی میں مطالعہ کی بہت اہمیت ہے۔ اس لیے طلبہ اپنے میں مطالعہ کی عادت پیدا کریں۔ جو اچھی اور عمدہ کتابوں کا مطالعہ کرنے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اچھی کتابوں کا مطالعہ ہی دل و دماغ کو روشن کرتا ہے اور ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ مطالعہ کرتے وقت غور و فکر لازمی ہے دلچسپی کے ساتھ پڑھیں۔ بے دلی سے مطالعہ نہ کریں۔ اس طرح کے مطالعہ سے ہی معلومات اور قابلیت میں اضافہ ہوگا۔ اور مطالعہ کرنے والے کا تعلیمی معیار بھی بلند ہوگا۔ ایسا تب ہی ممکن ہے جب طلبہ کو عام مطالعہ کا عادی بنایا جائے۔ ان میں نصاب اور نصاب سے باہر کی کتابیں پڑھنے کا ایک پاکیزہ مذاق اور بے پناہ شوق پیدا کیا جائے۔ تاکہ وہ کتب بینی کو اپنی فرصت کا ایک پسندیدہ اور محبوب شغل بنا سکیں۔ استاد کو چاہیے کہ وہ مطالعہ پر طلباء کا حوصلہ بڑھائے اور ایک مخلص ساتھی اور رہبر کی حیثیت سے قدم قدم پر ساتھ دے۔

ساتھ خود اعتمادی بھی پیدا کی جانی چاہیے۔ اس لیے بے ذوقی اور بے دلی کے ساتھ بیسیوں کتابیں پڑھانے کی نسبت طالب علموں میں مطالعہ کا ایک پاکیزہ مذاق اور دیرپا شوق پیدا کرنا جس کی بدولت وہ کوئی مطبوعہ یا قلمی عبارت دیکھ کر اسے روانی اور صحت کے ساتھ پڑھ سکیں اور خود سمجھ کر سنا اور سمجھا سکیں جو کہ ہر لحاظ سے بہتر اور افضل ہے۔ اس لیے مطالعہ آموزش کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ درس و تدریس میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک طرف معلومات حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے تو دوسری طرف انسانی تجربات ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ تہذیب و تمدن میں فروغ لانے کا ایک ذریعہ ہے۔

مطالعہ میں رہنمائی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس لیے طلبہ کو اچھا مطالعہ کنندہ بنایا جائے یعنی جو کچھ انہوں نے مطالعہ کیا ہے اس سے واجبی تفہیم کر سکیں اور زیر مطالعہ مواد سے وہ باتیں اخذ کر سکیں جن کا سمجھنا ضروری ہو۔ اخذ و قبول اور افہام و تفہیم کا معیار، مطالعے کے معیار کے ساتھ بدلتا جاتا ہے۔



UNIT IV

Teaching of Prose and Poetry, Evaluation

یونٹ (۴) ٹیچنگ آف پروز و پوسٹری، ایولویشن

چوتھا حصہ۔ چوتھی اکائی

”تدریس و نظم“

(اندازہ و تدریس)

(iii) نفس مضمون کی تفہیم (Understanding of Topic)

(iv) خلاصہ تختہ سیاہ (B.B. Summary)

(v) پیشکش کے طریقے (Methods of Presentation)

۹۔ انفرادی قرأت (Individual Reading)

۱۰۔ خاموش خوانی (Silent Reading)

۱۱۔ اندازہ قدر یا پرکھ یا جانچ (Evaluation)

اس میں موضوعی سوالات اور معروضی سوالات پوچھے جاتے ہیں۔

(i) موضوعی سوالات (Essay type Questions) ✓

(ii) معروضی سوالات (Objective Type Questions) ✓

۱۲۔ تفویض (گھر کا کام) (Assignment)

طریقہ تدریس زبان اُردو

(منصوبہ درس)

چونکہ تدریسی اقدامات (خواہ وہ نثر میں ہوں یا نظم) کی کامیابی مُعلم کی ذاتی قابلیت اور ہنرمندی پر منحصر ہے۔ ذیل میں تدریسی اقدام تحریر کئے جاتے ہیں۔

۱۔ مدرس کا نام، نمبر اور مضمون، عنوان، کلاس، تاریخ اور وقت وغیرہ پہلے درج کئے جاتے ہیں۔

۲۔ اس کے بعد امدادی اشیاء کا ذکر آتا ہے جس میں عام اشیاء مثلاً تختہ سیاہ، چاک کے چند ٹکڑے، اشاریہ وغیرہ آتے ہیں۔ اور خاص امدادی اشیاء میں ماڈلز، نقشے اور تصاویر وغیرہ آتے ہیں۔

۳۔ مقاصد عام اور مقاصد خاص: جن کا ذکر علیحدہ صفحہ پر درج ہے۔

۴۔ تمہید: اس میں بچوں سے ایسے سوالات پوچھے جاتے ہیں جن سے بچے سبق کی طرف راغب ہو جائیں اور سابقہ واقفیت کے طور پر بچوں سے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ اس میں نام، والد کے نام اور سبق کی طرف راغب کرانے کے لیے سوالات ہوتے ہیں اور آخر پر ایک سوال گریز کا کیا جاتا ہے تاکہ طلباء میں تجسس کا مادہ پیدا ہو۔

۵۔ اعلان سبق: گریز کے سوال کے بعد طلبہ کی ذہنی تشنگی دور کرنے کے لیے فوراً اعلان سبق کیا جائے اور عنوان درج تختہ سیاہ کیا جائے۔ طلباء میں ایسا ذوق

تدریس سبق کا آغاز کیا جائے۔

۶۔ قرأت معلم یا نمونہ عبارت خوانی یا پیشکش: اس میں معلم عبارت خوانی سے کام لیتا ہے۔ اس میں تلفظ کی صحیح ادائیگی، روانی، سلاست، تغیر لحن اور رموز و اوقاف کا خاص خیال رکھا جائے۔ نیز تفہیم عبارت اور تشریح وغیرہ کا خیال رکھا جائے۔ اگر سبق نظم کا ہو تو شاعر کا حوالہ ضروری ہے اور استحسان ادب کا خیال رکھا جائے۔

۷۔ طلباء کی انفرادی قرأت: معلم کی مثالی بلند خوانی کے بعد چند طلباء سے عبارت خوانی کرائی جائے تقریباً دو تین طلبہ سے ایسا کرنا ضروری ہے اور ان کے کئے ہوئے غلط تلفظ کے الفاظ درج تحت سیاہ کئے جائیں۔ ان کا صحیح تلفظ، معانی اور جملوں کی ساخت سکھائی جائے اور قواعد وغیرہ کی وضاحت کی جائے۔ مثلاً تذکیر و تانیث، واحد، جمع اور اسم، فعل، حرف وغیرہ کے بارے میں جانکاری دی جائے اور ساتھ ساتھ درج تحت سیاہ کر کے بچوں کو سمجھایا جائے۔

۸۔ اعادہ: سبق پر مجموعی سوالات کئے جائیں۔ طلباء سے عبارت کی مکرر بلند خوانی کرائی جائے۔

۹۔ اندازہ قدر یا جانچ: جانچ کے طور سبق پر مجموعی سوالات کئے جائیں۔ سوالات دو قسم کے ہوں (۱) موضوعی یا انشائیہ (Essay type) (۲) معروضی (Objective)

۱۰۔ تفویضی کام: سبق سے دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے سبق کے متعلق طلبہ کو گھر کا کام دیا جائے لیکن وہ کام موثر اور مختصر ہونا چاہیے تاکہ طلبہ وہ کام گھر سے کر کے لاسکیں۔

تدریس اُردو کے مقاصد

۱۔ طلباء میں اس بات کا احساس پیدا کرنا کہ اُردو قومی زبان ہے اس لیے انہیں اپنی قومی زبان سے محبت ہونی چاہیے۔

۲۔ اُردو، چونکہ ہندوستان کی مخلوط زندگی کی آئینہ دار ہے اس لیے اس مشترکہ تہذیب کی اقدار کا استحسان کرنا تدریس اُردو کا ایک اہم مقصد ہے۔

۳۔ طلباء میں اس بات کی صلاحیت پیدا کرنا کہ وہ زبان کے عملی پہلو معنی، بولنے، لکھنے، پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت پر قدرت حاصل کر سکیں اور اظہار مطالب کے لیے اپنی زبان کو صحت و صفائی، سلاست اور شائستگی کے ساتھ تقریر اور تحریر میں استعمال کر سکیں۔ نیز اپنی نجی اور کاروباری زندگی میں استفادہ کر سکیں۔

۴۔ طلباء میں مطالعہ کی ایسی عادت پیدا کرنا کہ وہ اردو ادبیات سے شغف پیدا کر سکیں۔

۵۔ اُردو زبان کی ابتداء، نشوونما اور ترقی کے مختلف مدارج سے طلباء کو واقف کرانا۔

۶۔ اصنافِ سخن اور مشاہیرِ ادب کے مطالعے سے استفادہ کر کے خود بھی کوئی اسلوب بیان اختیار کر سکیں۔

۷۔ طلباء میں منطقی اور استدلالی فکر کی صلاحیت پیدا کرنا۔

۸۔ تلفظ، مطلب اور ساخت کے نقطہ نظر سے الفاظ کے فرق کو سمجھنا تاکہ زبان کے لسانی پہلوؤں سے واقفیت پیدا کر سکیں۔

۹۔ طلباء میں سماجیاتی تحلیلی اور تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما کرنا۔

۱۰۔ قواعد زبان کا مطالعہ اور زبان کے صرفی و نحوی امور کی باقاعدہ تربیت دلانا۔

تدریس کی جدید تکنیک (Modern Techniques of Teaching)

آج کے دور میں تدریسی عمل کو مؤثر بنانے کے لیے جدید تکنیکوں پر زور دیا جا رہا ہے۔ ماہرین تعلیم نے ان نئی نئی تکنیکوں میں مختلف طریقوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان تکنیک میں سب سے اہم ”سوالات“ کی تکنیک ہے۔ جن کے ذریعہ سبق کو مؤثر اور کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔ سوالات اور ان کی اہمیت جب تک واضح نہ ہو ہم سبق کی کامیابی کی ضمانت نہیں دے سکتے۔

سوالات کی اہمیت

سوال بچے کی ذہنی زندگی کے لیے پہلا محرک ہوتا ہے۔ بقول ولیم جیمس: سوال کی تہہ میں حیرت، تعجب، جستجو اور شک۔ چھپے ہوتے ہیں۔ بقول کالون (Colvin) تدریس کی لیاقت بڑی حد تک پوچھے جانے والے سوالوں کے مزاج اور اس احتیاط سے ناپی جاتی ہے جو انہیں بنانے میں صرف کی گئی ہو۔ سقراط نے سوالات کے ذریعہ ہی تعلیم و علمی سرگرمیاں انجام دیں۔ اس کے اس طریقہ کو اسی کے نام سے (سقراطی طریقہ) یاد کیا جانے لگا۔ استاد اور طالب علموں کا تعلق اور اشتراک کے لیے سوالات ہی واحد اہم اور بنیادی ذریعہ ہیں۔

سوالات کے مقاصد

- (۱) تدریس کو مؤثر بنانا (۲) طلبہ کو تدریس میں مصروف رکھنا (۳) طلبہ کے تدریسی مسائل سے آگاہ ہونا (۴) طلباء کو قوت تخیلہ کو فروغ دینا (۵) طلبہ کی ترقی کا تعین کرنا (۶) علمی اور تعلیمی حالات کا پتہ چلانا (۷) طلباء کا اشتراک حاصل کرنا (۸) سبق پر توجہ مرکوز کرنا (۹) مقاصد خصوصی سے مربوط کرنا۔

خصوصیات

(۱) سوالات فکر انگیز ہوں (۲) آسان اور مختصر ہوں (۳) سبق اور سابقہ معلومات سے مربوط ہوں (۴) ایک سوال ایک خیال کا حامل ہو (۵) بامقصد ہوں (۶) حسب صلاحیت ہوں (۷) پوری جماعت سے مخاطب ہوں (۸) سوالات ہاں اور نہیں کے نہ ہوں (۹) بر محل ہوں۔

طلباء سے جواب لینے کے اصول

(۱) سوچنے کا موقع دیا جائے (۲) ہمت افزائی کی جائے (۳) ملامت نہ کی جائے (۴) نرم اور مشفقانہ لہجہ اختیار کیا جائے (۵) مکمل اور واضح جواب لئے جائیں۔

سوال تیار کرنے کا طریقہ

۱۔ سوال میں کیا، کب، کیسے استعمال کرنے کے بجائے موازنہ ہونا چاہیے۔
وجوہات بتائیے، تجزیہ کیجئے، وضاحت کیجئے، مثالوں کی مدد سے سمجھائیے۔
۲۔ سوال کی زبان آسان اور عام فہم ہو، ذو معنی الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔
۳۔ سوال معمہ کی صورت میں نہ ہو۔

۴۔ ہر سوال کے ساتھ واضح ہدایت ہو۔

۵۔ اختیاری سوال نہ دیا جائے بلکہ سوال کے اندر اختیاری نوعیت کے سوالات دیئے جائیں۔

۶۔ جواب مخصوص اور محدود کرنے کے لیے ہر قسم کی ضروری ہدایات دی جائیں۔

۷۔ سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے اشارہ بھی دیا جاسکتا ہو۔

۸۔ وقت کا تعین ضروری ہے تاکہ طلباء سب سوال حل کر سکیں۔

تختانوی درجوں کے لیے تدریسی اشارات و ”منصوبہ بند سبق“

تدریسی اشارات

عنوان: گائے

درجہ: سوم

تاریخ:

مضمون: اردو (نثر)

تدریس کے لیے ضروری سامان

- ۱۔ تختہ سیاہ، چاک کے چند ٹکڑے، اشاریہ، جھاڑن۔
- ۲۔ کالی گائے کی تصویر جس میں گھاس کے چند تنکے اور گائے گھاس کھا رہی ہو۔
- ۳۔ گائے، رنگ، کالا، صحن، ٹانگیں، دودھ، گھاس، کان، تھن کے لفظی کارڈ۔

مقاصد عمومی

- ۱۔ عبارت خوانی سکھانا۔
- ۲۔ ذخیرہ الفاظ بڑھانا۔
- ۳۔ چند نئے الفاظ کا تعارف

مقاصد خصوصی

بچوں میں بات چیت کا سلیقہ پیدا کر کے گائے کے بارے میں جانکاری دینا۔
طریقہ ہائے کار

۱۔ مقرون سے مجرد کی طرف

۲۔ معلوم سے نامعلوم کی طرف

پہلی منزل تشوِیق

بچوں میں سبق کی طرف میلان پیدا کرنے کے لیے اُستاد کا بطور تمہید مناسب بات چیت کرنا (اور طریقہ دیکھو بولو اپنانا)، راست طریقہ اختیار کر کے اُستاد: بچو! ادب سے بیٹھو۔ اتنے میں اُستاد کالی گائے کی تصویر نکال کر بچوں سے کہے گا یہ کس کی تصویر ہے۔ بچے جواب دیں گے کہ یہ گائے کی تصویر ہے۔

دوسری منزل (سبق کی طرف توجہ)

اُستاد: یہ سفید گائے ہے یا کالی گائے۔

جواب: یہ کالی گائے ہے۔

اُستاد (تصویر کی طرف اشارہ کر کے) دیکھو یہ کیا کر رہی ہے؟

جواب: گھاس کھا رہی ہے۔

اُستاد: کہاں گھاس کھا رہی ہے؟

نہ بتانے پر تصویر میں مکان اور اس کا صحن دکھا کر صحن کا لفظ نکلوائیں۔ نہ کہیں تو مدرس صحن کا لفظی کارڈ پیش کر کے کہہ دیکھو یہ وہ جگہ ہے جہاں گائے گھاس کھا رہی ہے۔

اُستاد: بتاؤ گائے گھاس کہاں کھا رہی ہے؟

جواب: صحن میں

صحن کا لفظ تختہ سیاہ پر لکھیں اور پڑھائیں۔

تختہ سیاہ پر لکھ کر دیکھو پڑھو کیا لکھا ہے؟

جواب: صحن

تختہ سیاہ پر صحن لکھ کر ”صحن“ میں کون کون سے حروف ہیں۔

ص، ح، ن

اور بدستور لفظ صحن کے سچے کرائیں۔

اُستاد: گھاس میں کون کون سے حروف ہیں؟ (گھ، ا، س)

”گھا“ کے بچے کرو (گھ۔ ا)

اسی طرح گائے میں کون کون سے حروف ہیں؟ (گ، ا، ئے)

”گائے“ کے بچے کرو (گ۔ ا۔ ئے)

اُستاد: اچھا ہم گائے کے بارے میں کچھ واقفیت حاصل کریں گے۔

(تصویر کی طرف اشارہ کر کے) دیکھو یہ گائے کی تصویر ہے۔

اس گائے کا رنگ کیسا ہے؟ جواب (اس گائے کا رنگ کالا ہے)۔

اُستاد: اس گائے کی کتنی ٹانگیں ہیں؟

جواب: اس گائے کی چار ٹانگیں ہیں۔

اُستاد: تختہ سیاہ پر لفظ ٹانگیں لکھ کر پڑھائے۔ اسی طرح اُستاد بچوں کو گائے کی تصویر

دکھا کر گائے کے بارے میں جانکاری فراہم کرے گا۔ جیسے: گائے کا رنگ

کالا ہے، اس کی چار ٹانگیں ہیں، یہ دودھ دیتی ہے، یہ گھاس کھاتی ہے۔ اس

کے دوکان ہیں، اس کے چار تھن ہیں، اس کو ہم گھر میں پالتے ہیں وغیرہ۔

یہ سب جانکاری اُستاد تختہ سیاہ پر لکھ کر بچوں کو مکالمہ اور طریقہ دیکھو بولو کے ذریعہ

فراہم کرے (راست طریقہ اپنا کر)

تیسری منزل (نئے الفاظ کی مشق)

بچوں نے گائے کے بارے میں جانکاری حاصل کی۔ اس جانکاری میں آئے

ہوئے نئے الفاظ بھی اب اُن کے لیے نئے نہیں رہے۔ تختہ سیاہ پر موجود ہیں۔

انفرادی طور پر یہ الفاظ بچوں سے پڑھائیں تاکہ شناخت اور پختہ ہو جائے۔ جیسے:

صحن، گائے، کالا، رنگ، ٹانگیں، دودھ، گھاس، کان، تھن وغیرہ۔

(اُستاد کے پاس لفظی کارڈ بھی ہوگا اور موقع پر پیش کیا جائے گا)

چوتھی منزل (پڑھائی کا نمونہ)

اُستاد: پڑھائی کا نمونہ پیش کرے گا اس کے بعد اجتماعی طور پر بھی پڑھائے گا۔ اس کے بعد انفرادی طور پر بچوں سے پڑھائے گا۔ پہلے کسی ہوشیار بچے سے، پھر اوسط درجے کے بچے سے۔ اس کے بعد کمزور سے، تلفظ اور لہجے کی درستی خود کرتے رہیں (دو تین منٹ خاموش مطالعہ کے لیے فراہم کئے جائیں گے)۔

پانچویں منزل (حانچ)

سبق سے متعلق سوالات کئے جاسکتے ہیں جیسے:

(i) (1) گائے کا رنگ کیا ہے؟

(ii) گائے کی کتنی ٹانگیں ہیں؟

(iii) گائے ہمیں کس کام آتی ہے؟

(2) حوالی جگہوں پر مناسب الفاظ بھر دیجئے

(i) گائے کی ٹانگیں ہیں (چار، دو، تین)

(ii) گائے دیتی ہے (خون، دودھ)

(iii) گائے کھاتی ہے (گھاس، بھوسہ، کچھ نہیں)

ہاں یا نہیں میں جواب لکھئے:

(i) گائے ایک پالتو جانور ہے (ہاں، نہیں)

(ii) گائے کا رنگ مختلف ہوتا ہے (نہیں، ہاں)

(iii) گائے کی دو ٹانگیں ہوتی ہیں (ہاں، نہیں)

پچھٹی منزل: عملی اور تفویہی کام

بچوں کو ”گائے“ پر پانچ جملے گھر پر لکھ کر لانے کو کہا جائے گا۔

نیز ”گائے“ کی تصویہ بھی بچوں سے کھینچنے کے جائے گی۔

منصوبہ درس

نام: رول نمبر:
 درجہ: ششم مضمون: اُردو
 عنوان: ہمارے جنگل تاریخ:
 وقت: ۳۰ منٹ

عام امدادی اشیاء برائے تدریس

چاک، تختہ سیاہ، جھاڑن، اشاریہ وغیرہ۔

خاص امدادی اشیاء برائے تدریس

تصاویر، ماڈل، الفاظ معانی چارٹ، اور درسی کتاب وغیرہ۔

عام مقاصد تدریس

طلباء کو زبان کی بنیادی ضروریات سے واقف کرانا تاکہ وہ معیاری اُردو بولنا، پڑھنا اور لکھنا سیکھ سکیں۔

نیز جملوں کی ساخت، اجزائے کلام، نئے الفاظ کے معانی، صحت تلفظ اور صحت املا پر توجہ دی جائے۔ اور طالب علموں میں آزادانہ غور و فکر کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ اور اردو رسم الخط اور قواعد کو تعلیم و تدریس کے جدید ترین طریقوں کی مدد سے سکھایا جائے۔

خاص مقاصد تدریس: درسی کتاب سے ہمارے جنگل کا مضمون پڑھانا (مضمون کا پہلا اقتباس) نئے الفاظ کے معانی، تشریح اور جملوں کی ساخت۔

تمہید

درج ذیل سوالات پوچھے گا/ پوچھے گی۔

(i) ہماری ریاست کا نام کیا ہے؟

ہماری ریاست کا نام ریاست جموں و کشمیر ہے۔

(ii) ریاست جموں و کشمیر دنیا بھر میں کیوں مشہور ہے؟

ریاست جموں و کشمیر دنیا بھر میں اپنی خوبصورتی کے لیے مشہور ہے۔

(iii) یہ خوبصورتی کن کن چیزوں پر مبنی ہے؟

اعلان سبق

چونکہ آخری سوال گریز کا ہے اس لیے اگر بچے جواب دیں تو ٹھیک اگر نہیں تو معلم/ معلمہ خود اعلان سبق کرتے ہوئے کہے گا کہ ہماری ریاست باغات، آب و ہوا اور جنگلات ہونے کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اور درسی کتاب ص ۸۰ پر کھولنے کو کہے گا/ کہے گی اور ساتھ تصویر متعلقہ عنوان (جنگلات کی تصویر) بھی پیش کرے گا/ کرے گی۔

تراث معلم/ تراث معلمہ

معلم/ معلمہ خود درسی کتاب سے عنوان کا پہلا اقتباس بطور نمونہ خوانی پیش کرے گا/ کرے گی۔ اور پڑھائی کے اصول مد نظر رکھ کر اقتباس پڑھے گا/ گی جیسے: بچو یہ آپ جانتے ہی ہیں کہ ہماری ریاست جموں و کشمیر میں مختلف قسم کے جنگل پائے جاتے ہیں تاخیر اقتباس۔ پیشکش میں معلم راست طریقہ اختیار کر کے معلوم سے نامعلوم کا اصول اپنائے گا/ گی اور اقتباس کی تشریح، سلیس اور نئے الفاظ کے معانی بتائے گا/ گی۔ اور ساتھ ساتھ درج تختہ سیاہ کر کے حلاصہ تختہ سیاہ بھی تیار کی جائے۔ جیسے: جنگل کی اہمیت اور افادیت سے بچے روشناس کئے جائیں گے اور نئے الفاظ کے معانی اور جملہ وغیرہ بھی سکھائے جائیں گے جیسے:

خلاصہ تختہ سیاہ

الفاظ	معانی	جملے
افادیت	فائدہ	جنگلات کی افادیت سے ہم سب باخبر ہیں
مہیا	میسر	جنگل تازہ ہوا مہیا کرتے ہیں
توازن	وزن برقرار رکھنا	جنگلات سے ماحول کا توازن قائم رہتا ہے
آلودگی	ناصافی، گندگی	ماحول کو آلودگی سے بچانا ہمارا فرض ہے
پیڑ	درخت	سرسبز پیڑ پودے آکسیجن صاف اور خالص بناتے ہیں

انفرادی قرأت: چند بچوں سے انفرادی طور پر پڑھایا ہوا سبق پڑھوایا جائے گا اور ساتھ ساتھ صحت تلفظ بھی سکھائے جائے گی۔

خاموش مطالعہ: بچوں کو چند منٹ بطور خاموش خوانی فراہم کئے جائیں گے۔

اعادہ: چند سوالات بطور اعادہ پوچھے جائیں گے جیسے:

۱۔ جنگلوں سے کیا فائدے ہیں؟ پیڑ پودوں کی افادیت کیا ہے؟

ہماری ریاست دنیا بھر میں کیوں مشہور ہے؟

جانچ: (۱) ہماری ریاست کا پورا نام کیا ہے؟

(۲) زندگی کی اہم ضروریات کیا ہیں؟

حالی جگہوں کو مناسب الفاظ سے پُر کیجئے

() خوراک، پانی اور ہوا کا سے گہرا تعلق ہے (باغات، جنگلات)

() تازہ ہوا مہیا کرتے ہیں (درخت، پودے)

() زندگی رہنے کے لیے بہت ضروری ہے (ہوا، فضا)

تفویضی کام: جانچ میں پوچھے گئے سوالات کے جوابات بچوں کو گھر پر حل کر کے لانے کو کہا جائے گا۔

منصوبہ بند درس

زیر تربیت اُستاد کا رول نمبر: درجہ: ہفتم (ساتویں)

مضمون: اُردو (نظم)

عنوان: پرندے کی فریاد (درسی کتاب سے)

وقت: تاریخ:

امدادی اشیاء

حسب دستور کمرہ جماعت کا تدریسی سامان مثلاً چاک، جھاڑن، تختہ سیاہ، اشاریہ، علامہ اقبالؒ کی تصویر اور پنجرہ میں بند پرندہ کی تصویر نیز نئے الفاظ کے معانی کا چارٹ وغیرہ (درسی کتاب بھی لازمی ہے)۔

تدریسی مقاصد

۱۔ طلباء میں اس بات کی مہارت پیدا کرنا کہ وہ صحیح وزن، بحر اور مصرعوں کی موزونیت کے ساتھ نظم پڑھ سکیں۔

۲۔ طلباء میں اس بات کی دلچسپی پیدا کرنا کہ وہ شوق سے نظم پڑھ سکیں۔

۳۔ شاعر کے جذبات و خیالات سے آگاہ کرانا۔

تدریسی مقاصد (خصوصی)

۱۔ طلباء کو نظم ”پرندے کی فریاد“ سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا کرانا۔

۲۔ طلباء کو اقبالؒ کے اسلوب بیان سے متعارف کرانا۔

تمہید

طلباء کو سبق کی جانب متوجہ کرانے کے لیے اُستاد حسب ذیل سوالات پوچھے گا۔
 ۱۔ چند بچوں سے ان کے ناموں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اس کے بعد بطور آمادگی اور سابقہ واقفیت حاصل کرانے کے لیے اقبالؒ کے کسی شعر سے ہی سوال کیا جائے گا تا کہ طلباء میں تحریک ذہنی پیدا ہو جائے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
 ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستان ہمارا
 یہ شعر کس کا ہے؟

طلباء اگر جواب دیں کہ یہ شعر اقبالؒ کا ہے تو ٹھیک اگر نہیں تو دونوں صورتوں میں اُستاد خود بتائے گا کہ یہ شعر اقبالؒ کا ہے۔ پھر اُستاد یہ دریافت کرے گا کہ اس شعر میں کس جذبے کی ترجمانی کی گئی ہے۔

اعلان سبق

سوال و جواب کی روشنی میں اُستاد اقبالؒ کی ملی اور انقلابی شاعری کو اجاگر کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور اس ضمن میں نظم ”پرندے کی فریاد“ کو متعارف کرائے گا اور طلباء کو اپنی اپنی درسی کتاب ص ۷۵ پر کھولنے کو کہے گا۔ ساتھ ہی تدریسی نمائش بھی استعمال کی جائیں گے جیسے: (پرندہ پنجرہ میں بند تصویر) علامہ اقبالؒ کی تصویر وغیرہ۔
 نمونے کی بلند خوانی

اُستاد مناسب لب و لہجہ اور ترنم کے ساتھ نظم پڑھ کر سنائے گا، طلباء اپنی کتابوں میں دیکھیں گے اور غور سے سنیں گے۔

نظم پڑھا کر اُستاد نظم کا اجمالی اور تفصیلی جائزہ لے گا اور خاص خاص نکات اور نئے الفاظ اور اُن کے معانی وغیرہ درجِ تحت سیاہ کرے گا۔ نیز نظم کی جانب طلباء کو

متوجہ کرانے کے لیے حسب ذیل سوالات پوچھے جائیں گے۔

(i) اس نظم میں کس چیز کا ذکر کیا گیا ہے؟

(ii) پرندے کو گزرے ہوئے زمانے کی کون کون سی باتیں یاد آ رہی ہیں۔

نظم سے لطف اندوز کرانے کے لیے ہر بند کو طلباء سے پڑھوایا جائے گا۔

اور اشعار کی خصوصیات کی جانب انہیں متوجہ کرایا جائے گا۔

بندا: آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ۔

شعرا: وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

(i) گذرا ہوا زمانہ کس کو یاد آتا ہے؟

(ii) گذرے ہوئے زمانے میں کون سی چیزیں یاد آتی ہیں؟

شعر ۲:

آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی

اپنی خوشی سے آنا، اپنی خوشی سے جانا

(۱) گھونسلے میں پرندے کو کس قسم کی آزادی تھی؟

شعر ۳:

لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم

شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا

(۱) پرندے کے دل پر چوٹ کس دم لگتی ہے؟

شعر ۴

وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت

آباد جس کے دم سے ہتا میرا آشیانہ

(۱) پرندے کا آشیانہ کس وقت آباد تھا؟

کیا بد نصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
 ساتھی تو ہیں وطن میں، میں قید میں پڑا ہوں
 (۱) پرندہ خود کو بد نصیب کیوں سمجھتا ہے؟

اسلوب بیان: بیانیہ نظموں میں یہ ایک بہت عمدہ نظم ہے کیونکہ کلام میں بہت
 زور بیان پایا جاتا ہے اس کے ذریعہ اقبالؒ نے آزادی اور غلامی کی صحیح عکاسی کی
 ہے۔

انفسِ راوی بلند خوانی

طلباء سے باری باری نظم کے اشعار پڑھوائے جائیں گے اور اس بات پر زور
 دیا جائے گا کہ پڑھتے وقت، تلفظ، مصرعوں کی موزونیت اور آہنگ کا خیال رکھا
 جائے گا۔ ساتھ ہی نئے الفاظ کے معانی اور جملوں کی ساخت بھی سکھائی جائے
 گی۔ جیسے:

الفاظ	معانی	جملے
جس دم	جس وقت	جس دم مجھے اپنے دوست سے ملاقات ہوئی میں بہت خوش ہوا
آشیانہ	گھونسلہ	پرندہ آشیانہ میں رہتا ہے
قفس	پنجرہ	شکاری نے پرندے کو قفس میں بند رکھا
رہائی	آزادی	مجرم کو جیل سے رہائی ملی

خلاصہ تختہ سیاہ

مندرجہ بالا الفاظ کے معانی اور جملے ساتھ ساتھ درج تختہ سیاہ کئے جائیں
 گے۔

اندازہ قدر: جانچ یا پرکھ

درج ذیل سوالات کے ذریعہ نظم کے مجموعی تاثر کو حاصل کیا جائے گا۔

(۱) موضوعی سوالات

۱۔ پرندے کو گزرے ہوئے زمانہ کی کون کون سی باتیں یاد آرہی ہیں؟

۲۔ پرندہ قفس میں کس کی آواز سننے کی آرزو کرتا ہے؟

۳۔ پرندہ خود کو بدنصیب کیوں سمجھتا ہے؟

معروضی سوالات

ہاں یا نہیں میں جواب لکھئے۔

۱۔ پرندہ قفس میں بند تھا (ہاں، نہیں)

۲۔ پرندہ قفس میں اپنی خوشی سے آتا بھی تھا اور جاتا بھی تھا (ہاں، نہیں)

۳۔ پرندے کے دل پر چوٹ لگی (ہاں، نہیں)

۲۔ حنائی جگہوں کو مناسب الفاظ سے بھر دیجئے

۱۔ پرندے کو گزرا ہوا زمانہ آتا ہے (بھول جاتا ہے، یاد آتا ہے)

۲۔ پرندے کے دل پر لگتی ہے (زخم، چوٹ)

۳۔ پرندہ اپنے آپ کو سمجھتا ہے (خوش نصیب، بدنصیب)

تفویضی کام

استاد طلباء کو جانچ میں پوچھے گئے سوالات کے جوابات گھر سے حل کرنے کے

لیے رکھے گا۔

مائیکرو ٹیچنگ

(Micro Teaching)

خرید تدریس

خرید تدریس کی اصطلاح پہلی بار ۱۹۶۳ء میں پروفیسر ”ایلن“ نے استعمال کی۔ پروفیسر ایلن (Allen) اسٹیفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر تھے۔ یہ ایسا تربیتی عمل ہے جس کا مقصد روزمرہ کی تدریسی پیچیدگیوں کو آسان بنانا ہے۔ یہ مختصر ہوتا ہے اس میں صرف ایک ہی مہارت کی مشق ہوتی ہے۔ اس کا نہ تو نصاب ہوتا ہے اور نہ اس کا کوئی مواد ہوتا ہے اور نہ کوئی مقررہ نصاب۔ اس میں طلبہ کی تعداد بھی محدود ہوتی ہے یہ ۵ سے ۱۵ تک ہوتی ہے اور اس کا وقت بھی مختصر ہوتا ہے ۵ یا ۱۰ منٹ۔

جب سبق پڑھایا جاتا ہے تو معلم کو مشاہدے کا جدول دے دیا جاتا ہے تاکہ وہ مشاہدہ کس طرح کریں اور اندراجات کس طرح لکھیں۔ ان کے لکھنے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ان کی حیثیت قدر پیمائی کے وسیلے کی ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ ایک ایک کر کے تمام تدریسی مہارتوں کی مشق ہو سکتی ہے۔ ذیل میں مختلف مہارتوں اور ان کے ذیلی مہارتوں کا ذکر ہے۔

(۱) تمہیدی مہارت یا سبق کے تعارف کا ہنر (Skill of Set Induction)

(i) Proper use of Teaching devices

(i) تدریسی تدابیر کا صحیح استعمال

(ii) Maintenance of Continuity

(ii) تسلسل قائم رکھنا

(iii) Relevant Statements and Questions

(iii) بر محل سوالات و بیانات

(iv) Questions followed by correct responses of pupil teacher

(iv) سوالات کے صحیح جوابات

(v) Use of previous knowledge by the Teacher Instructor

(v) سابقہ واقفیت کا استعمال

Teacher Instructor

Appropriateness of Teaching Device

تدریسی تدابیر کا موزون استعمال

Good Continuity restored

اچھا تسلسل پھر قائم کرنا

Skill of Stimulus variation

”محرك بدلنے کی مہارت“

اس مہارت کے اجزاء (Components) مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) مختلف تحریکات کا استعمال

(i) Movement (M)

(ii) Gestures (G)

(۳) توجہ مرکوز رکھنا، عدم توجہی دور کرنا

(iii) Focussing (F)

(۴) آواز بدلنا، تغیر آواز

(iv) Change of voice (CISP)

(۵) طلبہ کے درمیان باہمی عمل کو تحریک دینا

(v) Change in interaction styles (CIS)

(۶) توقف، سکون یا وقفہ

(vi) Pausing (P)

(۷) سمعی و بصری وسائل / ادلا بدلی

(vii) Oral Visual Switching (AVS)

(۸) طلبہ کی جسمانی شرکت

(viii) Physical Involvement of the Students (PI)

ہمت افزائی کی مہارت

Skill of Re-Inforcement

اس مہارت میں مندرجہ ذیل اجزاء (Components) شامل ہیں۔

(۱) مثبت اور مناسب لسانی ہمت افزائی

(i) Positive Verbal Reinforcement (PVR)

(۲) مثبت غیر لسانی عمل کا استعمال

(ii) Positive Non-Verbal Reinforcement (PNVR)

(۳) مزید لسانی ہمت افزائی

(iii) Extra Verbal Reinforcement (EVR)

(۴) انکاری لسانی ہمت افزائی

(iv) Negative Verbal Reinforcement (NVR)

(۵) انکاری غیر لسانی ہمت افزائی

(v) Negative Non Verbal Reinforcement (NNVR)

(۶) دہرانا

(vi) Repeating and Rephrasing

(۷) تختہ سیاہ پر طلباء کا تحریری جواب

(vii) Writing Pupils Answer on the Black Board

سوال پوچھنے کی مہارت

Skill of Probing Questioning

اس مہارت میں درجہ ذیل اجزاء (Components) شامل ہیں۔

(۱) مناسب یا اشاراتی سوال

(i) Prompting

(۲) مزید معلوماتی سوال پوچھنا

(ii) Seeking Further Information

(۳) دوبارہ توجہ مرکوز سوال

(iii) Re-Focussing

(۴) فکر انگیز یا تفہیمی سوال

(i) Increasing Critical Awareness

(۵) دوبارہ علم حاصل کرنے کی رفتار بڑھانا

(v) Re-Directing

تدریسی مہارتوں یا ہنروں کا مجموعہ

Integration of Teaching Skills

مکرو تدریس کا مجموعی مہارتوں یا ہنروں کا درس

Micro-Lesson for Integration of Skills

تخت سیاہ استعمال کرنے کی مہارت یا ہنر

Skill of Using Black Board

اس مہارت یا ہنر میں مندرجہ ذیل اجزاء (Components) شامل ہیں۔

(۱) حروف صاف ضبط تحریر ہیں

(i) Letters are clearly written

(۲) دو لفظوں کے درمیان کافی فاصلہ

(ii) Sufficient space between two words

(۳) دو حرفوں کے درمیان کافی فاصلہ

(iii) Sufficient space between two letters

(۴) مناسب تشکیل حروف

(iv) The shape of the letters is appropriate

(۵) الفاظ اور جملے سیدھی سطروں میں مرقوم ہیں

(v) The words and sentences are written in straight lines

(۶) مرقوم سطور آپس میں متوازی ہیں

(vi) The written lines are parallel

(۷) فروغی چیزوں کا ترک کرنا

(vii) Unwanted things were erased

(۸) نکتوں کا تسلسل رکھنا

(viii) The points are written sequentially

(۹) نکتوں کا صاف اور سمجھدار طور جملوں میں لکھنا

(ix) The points are clearly and comprehensively written

as sentences

(۱۰) برائے تصحیح خاص خاص نکتے اور الفاظ خط کشیدہ ہیں

(xi) For correction, the main points and words are

underlined

(۱۱) توجہ مرکوز کے لیے رنگین چاک کا استعمال

(xi) For Focuss coloured chalks are used

(۱۲) تصاویر میں شفافیت یا تصاویر صاف و شفاف ہیں

(xii) Pictures and diagrams are neatly and clearly made

(۱۳) حرفوں کے طول و عرض میں یکسانیت

(xiii) The breadth and length of letters is the same

فروق مابین مائیکرو اور میکرو لیسن پلان

(Difference between Macro Lesson Plan and Micro Lesson Plan)

”خُرد تدریس اور کلان تدریس میں فرق“

Macro Lesson Plan منصوبہ درس کلان	Micro Lesson Plan منصوبہ درس خُرد
۱۔ اس کلان تدریس کے منصوبہ درس میں طلباء کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور مکمل کرنے کے لیے ۳۰ سے ۳۵ منٹ کا وقت دیا جاتا ہے	۱۔ اس خُرد تدریس کے منصوبہ درس میں طلباء کی تعداد بہت کم ہوتی ہے اور موضوع مکمل کرنے کے لیے ۵ سے ۷ منٹ دئے جاتے ہیں
۲۔ یہ منصوبہ درس طویل ہوتا ہے	۲۔ یہ منصوبہ درس مختصر ہوتا ہے
۳۔ یہاں ایک ہی دن میں موضوع سے متعلق تمام skills یعنی ہنر یا مہارتوں کا استعمال کرنا پڑتا ہے	۳۔ اس منصوبہ درس میں الگ الگ skill یعنی ہنر یا مہارتوں کے استعمال کی مشق کروائی جاتی ہے
۴۔ اس منصوبہ درس میں زیر تربیت اُستاد سے اگر غلطی ہو تو اسی کے مرتب کردہ پلان یعنی منصوبہ درس کے اوپر نگران اچھے یا بُرے تاثرات لکھ دیتا ہے	۴۔ اس منصوبہ درس میں اگر زیر تربیت اُستاد سے غلطیاں سرزد ہوں تو درس دوبارہ بنانے کو کہا جاتا ہے اور اس پر تنقید کی جاتی ہے اسے سزا نہیں دی جاتی

۵۔ اس منصوبہ درس میں زیر تربیت اُستاد چھٹی سے نویں جماعت تک کسی بھی موضوع کو پڑھانے کی کوشش کرتا ہے جو طالب علم پہلے سے پڑھ رہے ہوں	۵۔ اس منصوبہ درس کو مرتب کرنے کے لیے چھٹی سے نویں جماعت تک کسی بھی موضوع کو لیا جاسکتا ہے
۶۔ منصوبہ تدریس کے عمل میں زیر تربیت اُستاد کو مختلف سرکاری یا غیر سرکاری سکولوں میں جانا پڑتا ہے	۶۔ منصوبہ تدریس کے عمل میں زیر تربیت اُستاد کو اپنے ہی کالج کے اندر مختلف گروہوں میں بانٹا جاتا ہے
۷۔ جب کہ اس منصوبہ درس میں وقت اور کام زیادہ ہوتا ہے	۷۔ جب کہ اس منصوبہ درس کے دوران وقت کم اور کام زیادہ ہوتا ہے
۸۔ اس منصوبہ درس کے ذریعے زیر تربیت اُستاد کو مکمل اُستاد بننے کی مشق کرا کے تربیت دی جاتی ہے	۸۔ اس منصوبہ کے ذریعے زیر تربیت اُستاد کو تدریس کے لیے تیار کیا جاتا ہے
۹۔ یہاں Skill یعنی مہارت کے مطابق سوالات پوچھے جاتے ہیں	۹۔ یہاں Skill یعنی مہارت کے مطابق سوالات پوچھے جاتے ہیں
۱۰۔ جب کہ اس منصوبہ درس کے دوران اُستاد یا نگران موجود نہ ہو تو گروپ لیڈر مشاہدے کے فرائض انجام دے سکتا ہے	۱۰۔ اس منصوبہ درس کے دوران اگر اُستاد یا نگران موجود نہ ہو تو گروپ لیڈر مشاہدے کے فرائض انجام دے سکتا ہے
۱۱۔ اس منصوبہ درس میں نصاب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ یہاں زیر تربیت اُستاد کو ہی سبق تیار کرنا ہوتا ہے جو متعلقہ جماعت کے طلباء کو پڑھنا ہوتا ہے	۱۱۔ اس منصوبہ درس میں نصاب کو اہمیت نہیں دی جاتی ہے بلکہ زیر تربیت اُستاد اپنی مرضی سے منصوبہ درس تیار کرتے ہیں

نمونہ منصوبہ درس خرد تدریس

Model Micro Lesson Plan

نام: _____ رول نمبر: _____ تاریخ: _____
 درجہ: چھٹی (پیر گروپ) وقت: ۶ منٹ
 مضمون: اردو عنوان یا موضوع: ”صحت اور صفائی“
 سیشن: Teach/Re-teach پڑھانا/ پھر سے پڑھانا
 (Skill of Set Induction)

تمہیدی مہارت

Components of the Skill used	Students Activity	Teacher's Activity
استعمال شدہ اجزائے مہارت	شاگرد کی سرگرمی	اُستاد کی سرگرمی
	طلباء بھی سلام و آداب بجالاتے ہیں	اُستاد طلبہ کے ساتھ سلام و آداب سے ہمکلام ہو جاتا ہے
Using previous knowledge (UPK) سابقہ واقفیت کا استعمال	ہماری زندگی کا دار و مدار صحت پر ہے	۱۔ ہماری زندگی کا دار و مدار کس چیز پر ہے؟
Maintenance of Continuity (MoC) تسلل قائم رکھنا	صحت کے لیے تازہ ہوا، غذا، صاف پانی اور صفائی ضروری ہے	۲۔ صحت کے لیے کیا کیا ضروری ہے؟

Maintenance of Continuity (MoC)	۳۔ صحت کے لیے تازہ ہوا، غذا اور صاف پانی کے ساتھ ساتھ صفائی کا تسلسل جاری ہے	۳۔ صحت کے لیے تازہ ہوا، غذا، صاف پانی کے ساتھ ساتھ کس چیز کا خیال رکھنا چاہیے؟
Using appropriate Devices (UAD)	۴۔ یہ کیا ہے؟ (صاف پانی سے بھرا ہوا گلاس)	۴۔ یہ کیا ہے؟ (صاف پانی سے بھرا ہوا گلاس بچوں کو دکھاتا ہے)
Relevance of verbal and non verbal behaviour (RVNBS)	۵۔ صاف پانی پینے سے کیا فائدے ہیں؟	۵۔ صاف پانی پینے سے کیا فائدے ہیں؟
Maintenance of Contunity (MOC)	۶۔ ہوا اور پانی کے بعد سب سے ضروری چیز اچھی غذا ہے	۶۔ ہوا اور پانی کے بعد سب سے ضروری چیز کیا ہے؟
Using previous knowledge maintenance of continuity upk/Moc	۷۔ اچھی غذا وہی ہے جو ہلکی، سادہ، قوت بخش اور تازہ ہو	۷۔ اچھی غذا کیا ہے؟
	۸۔ غذائی اجناس کہاں سے حاصل ہوتے ہیں	۸۔ غذائی اجناس کہاں سے حاصل ہوتے ہیں
	استاد جواب کا منتظر ہے/کوئی جواب نہیں	استاد طلباء سے ہم کلام ہو کر میں آج تازہ ہوا، تازہ پانی اور تازہ غذا کے بارے میں کچھ واقفیت دوں گا

نمونہ منصوبہ درس خرد تدریس

Model Micro Lesson Plan

حرک بدلنے کی مہارت (Skill of Stimulus Variation)

نام: رول نمبر: تاریخ:

درجہ: آٹھویں وقت: ۶ منٹ

مضمون: اردو عنوان: ”آلودگی“

سیشن: Teach/Re-teach پڑھانا/ پھر سے پڑھانا

(Skill of Stimulus Variation)

حرک بدلنے کی مہارت

Components of the Skill used	Students Activity	Teacher's Activity
استعمال شدہ اجزائے مہارت	شاگرد کی سرگرمی	اُستاد کی سرگرمی
	وعلیکم السلام واجب الاحترام اُستاد	پیارے بچو! السلام علیکم
Change in Interaction Style (CIS)	ماحول خراب ہونے کے بہت سے وجوہات ہیں مثلاً ہوا، پانی اور غذا کی ناصافی	۱۔ ماحول خراب ہونے کے کچھ وجوہات بتائیے
Audio Visual Switching	یہ ناصاف پانی سے بھرا ہوا گلاس ہے یا گلی سڑی سبزیوں کے کچھ ٹکڑے ہیں	۲۔ ناصاف پانی سے بھرا ہوا گلاس یا گلی سڑی سبزیوں کے کچھ نمونے بچوں کو دکھا کر اُستاد بچوں سے سوال پوچھے گا یہ کیا ہے؟
سمعی و بصری وسائل کا استعمال		

Change in Inter active style (CIS) طلباء کا باہمی عمل متحرک بنانا	۳۔ ناصاف اور گندہ چیزوں کے جمع ہونے سے کیا ہو جاتا ہے؟ (Pause) (وقفہ)	۳۔ ناصاف اور گندہ چیزوں کے جمع ہونے سے ماحول خراب ہو جاتا ہے
Audio Visual Switching Movement سمعی بصری و تسلیسی وسائل کا استعمال تحریکات	۴۔ استاد چند خراب اور بوسیدہ اشیاء کے نام تختہ سیاہ پر درج کرے گا	۴۔ استاد چند خراب اور بوسیدہ اشیاء کے نام تختہ سیاہ پر درج کرے گا
Pause (P) وقفہ Physical Involvement of the student بچوں کی جسمانی تحریک یا شرکت	۵۔ کچھ وقفہ کے بعد استاد کسی ایک بچے سے اشارہ کرتے ہوئے کہے گا کہ بوسیدہ چیزوں سے کیا کیا خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں؟	۵۔ بچے سوچنے لگیں گے
Focussing (F) توجہ مرکوز کرنا Audio-Visual Switching (AVS) سمعی و بصری وسائل کا استعمال	۶۔ استاد چند خرابیوں کا ذکر درج تختہ سیاہ کرے گا مثلاً بوسیدہ چیزوں کے جمع ہونے سے ماحول خراب ہو جاتا ہے، آلودگی بڑھتی ہے جس سے انسانی صحت پر برا اثر پڑتا ہے اور انسان بیمار ہو جاتا ہے	۶۔ استاد چند خرابیوں کا ذکر درج تختہ سیاہ کرے گا مثلاً بوسیدہ چیزوں کے جمع ہونے سے ماحول خراب ہو جاتا ہے، آلودگی بڑھتی ہے جس سے انسانی صحت پر برا اثر پڑتا ہے اور انسان بیمار ہو جاتا ہے
جسمانی تحریک (Gesture)	استاد جسمانی تحریکات (Gestures) سے کام لیتے ہوئے تختہ سیاہ پر تحریر شدہ اہم نکات کا اعادہ کرتے ہوئے دہرائے گا۔	استاد جسمانی تحریکات (Gestures) سے کام لیتے ہوئے تختہ سیاہ پر تحریر شدہ اہم نکات کا اعادہ کرتے ہوئے دہرائے گا۔
(AVS) Audio Visual Switching سمعی و بصری وسائل (PI) Physical Involvement جسمانی تعاون سے کام لینا	۷۔ استاد بچوں میں سے ایک بچے کو آگے لاتے ہوئے آلودگی کی برائیاں تختہ سیاہ پر لکھنے کے لیے کہے گا	۷۔ بچہ یا شاگرد آگے آکر تختہ سیاہ پر آلودگی کی برائیاں تحریر کرتا ہے

(AVS) Audio Visual Switching سمعی و بصری وسائل Pausing/ Focussing وقفہ اور توجہ مرکوز ہونا		اُستاد آلودگی کے بارے میں بنایا ہوا ایک چارٹ یا تصویر دیوار پر آویزاں کرے گا اور آلودگی سے پیدا شدہ خرابیوں کا ذکر کرے گا۔ اور تصویر کے ذریعہ ان خرابیوں کے انسانی صحت پر اثرات کے بارے میں مکمل جانکاری دے گا
(PI) Physical Involvement جسمانی تحریک (CI) Change in Interaction طلباء کا باہمی عمل متحرک کرنا	ایک شاگرد آگے آکر متعلقہ تصویر کے ذریعہ سبق کا اعادہ کرتا ہے	اب اُستاد بچوں میں سے ایک کو آگے لائے گا اور چارٹ یا تصویر کے ذریعہ سبق کا اعادہ کرائے گا
(CISP) Change in speech pattern توضیح و تشریح کی مناسب تبدیلی اور بولنے کا بدلاؤ	کچھ نہیں	اُستاد بچوں سے مزید پوچھے گا کہ آلودگی کے بارے میں آپ کو اور کچھ کہنا ہے
	شکریہ	شکریہ

نمونہ منصوبہ درس خرد تدریس

Model Micro Lesson Plan

نام: رول نمبر: تاریخ:

درجہ: آٹھویں وقت: ۶ منٹ

مضمون: اردو عنوان: ”حمد“

سیشن: Teach/Re-teach پڑھانا/ پھر سے پڑھانا

(Skill of Re-inforcement)

ہمت افزائی مہارت

Components of the Skill used	Students Activity	Teacher's Activity
استعمال شدہ اجزائے مہارت	شاگرد کی سرگرمی	اُستاد کی سرگرمی
	بچے: علیکم السلام اُستاد: محترم	مدرس کلاس میں داخل ہوتے ہی بچوں کے ساتھ ہمکلام ہونے سے پہلے سلام و آداب بحال لائے گا، کہے گا: السلام علیکم
(PVR) Positive Verbal Reinforcement ثبت لسانی ہمت توصیفی الفاظ (Praise Words)	خدا تعالیٰ کی تعریفوں کو حمد کہتے ہیں	حمد کسے کہتے ہیں؟ بہت اچھا!

(PNVR) Positive non-verbal Reinforcement/ Gestures مثبت غیر لسانی ہمت افزائی (جسمانی حرکات)	زمین و آسمان کا مالک خدا ہے	کون و مکان (زمین و آسمان) کا مالک کون ہے؟ (اُستاد اپنا سر اوپر نیچے ہلاتا ہے)
(P.V.R) Positive Verbal Reinforcement مثبت لسانی ہمت افزائی Praise Words)) توصیفی الفاظ	خدا تعالیٰ رحیم ہے، وہ رحمان بھی ہے خالق و مالک ہے	خدا تعالیٰ کی چند صفتوں کے نام بتائیے (ہاں) ٹھیک
(PVR) Positive Verbal Reinforcement مثبت لسانی ہمت افزائی Praise words and use of statement اظہار توصیف	یوم جزا کا مالک خدا ہے	یوم جزا (قیامت کا دن) کا مالک کون ہے؟ (شاباش! بہت اچھا جواب)
(PVR) Positive Verbal Reinforcement مثبت لسانی ہمت افزائی	مدد خدا تعالیٰ سے مانگی جائے	مدد کس سے مانگی جائے؟ (ٹھیک)
(PNVR) Positive non-verbal Reinforcement مثبت غیر لسانی ہمت افزائی (تھپکانا)	بچہ ٹھیک طرح سے صحیح جواب دیتا ہے کہ ہمیں مدد خدا سے مانگی چاہیے	اُستاد دوسرے بچے سے اشارہ کر کے پھر سے یہی سوال پوچھتا ہے

(PVR) Positive Verbal Re-inforcement/ praise words مثبت لسانی ہمت افزائی توصیفی الفاظ کا استعمال	شاعر کے دل میں سچائی کے راستے پر چلنے کی آرزو ہے	شاعر کے دل میں کیا آرزو ہے؟ (بہت خوب)
(PVR) Positive Verbal Reinforcement مثبت لسانی ہمت افزائی Praise words تعریفی الفاظ کا استعمال	خدا کی نظر میں عابد لوگ شان و شوکت والے ہیں	خدا کی نظر میں کون سے لوگ شان و شوکت والے ہیں؟ (بہت اچھا)
(PVR) Positive Verbal Reinforcement مثبت لسانی ہمت افزائی Praise Words توصیفی الفاظ کا استعمال	خدا کی نظر میں اللہ کی بتائے ہوئے صحیح راستے پر نہ چلنے والے گمراہ	خدا کی نظر میں کون سے لوگ گمراہ ہیں؟ (اُستاد مسکرا کے شاگردوں کا ہیں جواب دہراتا ہے)
(PNVR) Positive Non- verbal Reinforcement/ Gestures مثبت غیر لسانی ہمت افزائی اور جسمانی محرکات کا استعمال	خدا نے نبیوں، سچ بولنے والوں شہیدوں اور نیک لوگوں کو اپنی نعمت سے نوازا	خدا نے کن لوگوں کو اپنی نعمت سے نوازا؟ (اُستاد اس سوال کا جواب درج تختہ سیاہ کرتا ہے)
(PNVR) Positive Non-verbal Reinforcement مثبت غیر لسانی ہمت افزائی	مجموعی طور خدا کی چند صفات یہ ہیں: وہ رحیم ہے، رحمان ہے، مالک ہے، خالق ہے اور رزاق ہے	اُستاد سوال کرتا ہے مجموعی طور خدا کی چند صفات کے نام بتائیے

	ہمیں خدا تعالیٰ کے سامنے جو سب سے عظیم ہے جھکنا چاہیے	اُستاد اسوال کا جواب تختہ سیاہ پر درج کرتا ہے ہمیں کس بڑی ہستی کے سامنے جھکنا چاہیے؟
(PVR) Positive Verbal Reinforcement مثبت لسانی ہمت افزائی Use of Statement زبانی اظہار		(اُستاد تصویر دکھاتا ہے) بہت اچھا آپ نے صحیح جواب دیا
	شکریہ جناب۔	بچو! آج آپ کو ”حمد“ کے بارے میں پوری جانکاری ملی۔ اس لیے آج کا سبق ختم ہوایا اختتام کو پہنچا۔ شکریہ

نمونہ منصوبہ درس خرد تدریس

Model Micro Lesson Plan

نام: رول نمبر: تاریخ:

درجہ: آٹھویں وقت: ۶ منٹ

مضمون: اردو عنوان: موسم بہار

سیشن: Teach/Re-teach پڑھانا/پھر سے پڑھانا

(Skill of Probing Questioning)

سوال پوچھنے کی مہارت

Components of the Skill used	Students Activity	Teacher's Activity
استعمال شدہ اجزائے مہارت	شاگرد کی سرگرمی	اُستاد کی سرگرمی
	بچے جواباً دیکھیں السلام	اُستاد کلاس میں داخل ہوتے ہی بچوں سے ہمکلام ہونے سے پہلے سلام و آداب بجالاتا ہے۔ کہتا ہے السلام علیکم
(PQ) Prompting Question	آج سردی ہے	آج موسم کیا ہے؟ ①
اشاراتی سوال۔ بنیادی سوال	باہر کی ہوا سے ہم سردی محسوس کر رہے ہیں	آپ کیسے سردی محسوس کر رہے ہو؟ ②
(SFI) Seeking further information	مزید معلوماتی سوال	

(SFI) Seeking Further Information مزید معلوماتی سوال	سال میں کتنے موسم ہوتے ہیں؟ (3)	سال میں چار موسم ہوتے ہیں
(SFI) Seeking Further Information مزید معلوماتی سوال	کون کون سا موسم؟ (4)	موسم بہار، موسم گرما، موسم خزاں اور موسم سرما
(SFI) Seeking Further Information مزید معلوماتی سوال	آج کون سا موسم ہے؟ (1)	آج موسم سرما ہے
(SFI) Seeking Further Information مزید معلوماتی سوال	موسم سرما کے بعد کون سا موسم آتا ہے؟ (1)	موسم سرما کے بعد موسم بہار آتا ہے
(RF) Refocussing بچوں کی توجہ کو مرکوز رکھنا یا عدم توجہی دور کرنا	موسم بہار میں جب آپ باہر ادھر ادھر گھومتے پھرتے ہو تو کیسا لگتا ہے؟	باہر ادھر ادھر گھومنے اور پھرنے میں موسم سہاؤ نا لگتا ہے
(SFI) Seeking Further Information مزید معلوماتی سوال	کشمیر میں یہ موسم کیسی شان رکھتا ہے؟	کشمیر میں یہ موسم اپنی نرالی شان رکھتا ہے
(R.F) Re-Focussing توجہ مرکوز سوال	یہ موسم اپنی نرالی شان کیوں رکھتا ہے؟	اس موسم میں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہوتا ہے پھول کھلتے ہیں سیاح سیر کے لیے آتے ہیں
(RD) Re-Directing علم حاصل کرنے کی رفتار آگے بڑھانا	اُستاد دوسرے بچے سے یہی سوال آگے بڑھا کے پوچھتا ہے اس موسم میں سیاح لوگ کشمیر کیوں آتے ہیں؟	کشمیر میں ہر طرف رونق ہی رونق اور باغوں میں خوبصورتی ہوتی ہے اس لیے سیاح لوگ کشمیر آتے ہیں
(SFI) Seeking Further Information مزید معلوماتی سوال	موسم بہار سب موسموں میں کیسا ہوتا ہے؟	موسم بہار سب موسموں میں خوشگوار ہوتا ہے
(SFI) Seeking Further Information مزید معلوماتی سوال	کشمیر کی وادی اس موسم میں کیسی ہوتی ہے؟	کشمیر کی وادی اس موسم میں معطر اور خوبصورت ہوتی ہے

(RF) Re-Focussing توجہ مرکوز سوال	تصویر دیکھ کر بچے جواب دیتے ہیں کہ بہار بہت خوبصورت دکھائی دیتا ہے	اُستاد بہار کی تصویر بچوں کو دکھا کر سوال پوچھے گا کہ موسم بہار کیسا لگتا ہے
(SFI) مزید معلوماتی سوال	موسم بہار کے بعد موسم گرما آتا ہے	موسم بہار کے بعد کون سا موسم آتا ہے
(ICA) Increasing Critical Awareness فکر انگیز اور تنقیدی سوال کا استعمال	بچے موسم بہار پر دس جملے بنا کر اپنی اپنی نوٹ بکوں پر لکھیں گے	مندرجہ بالا معلومات ذہن میں رکھتے ہوئے اُستاد بچوں سے موسم بہار پر دس جملے لکھنے کے لیے کہے گا
	شکریہ۔	بہت اچھا! آج ہم نے موسم بہار پر ایک مضمون تیار کیا اور جانکاری حاصل کی۔

نمونہ منصوبہ درس خرد تدریس

Model Micro Lesson Plan

تختہ سیاہ پر لکھنے کی مہارت یا تختہ سیاہ استعمال کرنے کی مہارت
(Skill of Black Board Writing)

نام: رول نمبر: تاریخ:

درجہ: آٹھویں وقت: ۶ منٹ

مضمون: اردو عنوان: موسم بہار

سیشن: Teach/Re-teach پڑھانا/ پھر سے پڑھانا

Skill: مہارت - تختہ سیاہ کا استعمال

شہری زندگی	دیہاتی زندگی
۱۔ شہروں کی آبادی دیہاتوں کی نسبت کم ہے	۱۔ دیہاتوں کی آبادی زیادہ ہے
۲۔ شہروں کے لوگ کاروباری اور دکانداری کا کام کرتے ہیں	۲۔ دیہاتوں کے لوگ کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں
۳۔ شہروں کی آب و ہوا، شور و غل اور گھنی آبادی کی وجہ سے دیہاتوں کی نسبت آلودہ ہوتی ہے	۳۔ دیہاتوں کی آب و ہوا شہروں کی نسبت اچھی اور سہاؤنی ہوتی ہے
۴۔ شہریوں کی صحت دیہاتیوں کی نسبت اچھی نہیں ہوتی ہے	۴۔ دیہاتیوں کی صحت شہریوں کی نسبت اچھی ہوتی ہے

۵۔ دیہات کی عورتیں گھر کا سارا کام کرنے کے علاوہ مردوں کے دوش بدوش کھیتوں میں کام کرتی ہیں	۵۔ شہروں کی عورتیں اکثر ملازم پیشہ ہوتی ہیں
۶۔ ہماری زندگی کی ضروریات دیہات سے مہیا ہوتی ہیں مثلاً اناج، خوراک وغیرہ وغیرہ چیزیں	۶۔ شہروں میں بازار اور کارخانے اور سرکاری دفاتر وغیرہ موجود ہوتے ہیں اور شہر علم کے مراکز مانے جاتے ہیں
۷۔ دیہاتی زندگی شہری زندگی کی نسبت سادہ مانی جاتی ہے	۷۔ شہری زندگی دیہاتی زندگی کی نسبت فیشن اور نمود و نمائش سے آلودہ ہوتی ہے
۸۔ دیہاتوں میں اکثر چیزوں کا فقدان ہوتا ہے اور حفظانِ صحت کی سہولیات میسر نہیں	۸۔ شہروں میں چیز کثرت سے مہیا ہوتے ہیں حفظانِ صحت کی سہولیات میسر ہیں



نمونہ منصوبہ درس خرد تدریس

Model Micro Lesson Plan

تختہ سیاہ پر لکھنے کی مہارت یا تختہ سیاہ استعمال کرنے کی مہارت

(Skill of Black Board Writing)

S.No نمبر شمار	Components اجزائے مہارت	Minimum قلیل مقدار یا تعداد	Average اوسط	Maximum زیادہ سے زیادہ مقدار یا تعداد
1.	Letters are clearly written حروف صاف ضبط تحریر ہیں			
2.	Sufficient space between two words دو لفظوں کے درمیان کافی فاصلہ			

Sufficient space between two letters	دو حرفوں کے درمیان کافی فاصلہ				
The shape of letters is appropriate	مناسب تشکیل حروف				
The words are sentences are written in straight line	الفاظ اور جملے سیدھی سطروں میں مرقوم ہیں				
The written lines are parallel	مرقوم سطور آپس میں متوازی ہیں				
Unwanted things were erased	فروغی چیزوں کا ترک کرنا				
The points are written sequentially	نکتے تسلسل سے درج ہیں				

					The points are clearly and comprehensively written as sentences نکتوں کا صاف اور سمجھدار طور جملوں میں استعمال کرنا				
					For correction, the main points and words are under lined برائے تصحیح خاص نکتے اور الفاظ خط کشیدہ ہیں				
					For laying focus, coloured chalks are used توجہ مرکوز کرنے کے لیے رنگین چاک کا استعمال				
					Pictures and diagrams are neatly and clearly made تصاویر میں شفافیت یا تصاویر صاف و شفاف ہیں				
					The breadth and length of letters is the same حروف کے طول و عرض میں یکسانیت				

نمونہ بر منصوبہ درس خرد تدریس

Model Micro Lesson Plan

(Integration of Skills) مہارتوں کا مجموعہ

جماعت: چھٹی

رول نمبر:

نام:

تاریخ:

عنوان: ”اسم“ اور اس کی قسمیں

مضمون: اُردو

سیشن: Teach/Re-Teach / پڑھانا / پھر سے پڑھانا

”مجموعی مہارتوں کی مہارت“ (Skill of Integration of Skills)

Components Used	اجزائے مہارت	استعمال شدہ	Student's Activity	Teacher's Activity
PQ	SV	SI	استاد کی سرگرمی	استاد کی سرگرمی
سوال پوچھنے کی مہارت	حرک بدلنے کی مہارت	تمہیدی مہارت		
ہمت افزائی مہارت				

CC-0 Agamnigam Digital Preservation Foundation, Chandigarh Funding by IKS MoE-2025-Grant

(SFI) مزید معلوماتی سوال	R (PVR) لسانی ہمت افزائی	(F) (AVS) توجہ مرکوز اور سمعی و بصری وسائل کا استعمال	(UPK) سابقہ واقفیت	اسم وہ لفظ ہے جو کسی جاندار یا شے یا کیفیت کا نام ہو	اسم کے کہتے ہیں؟ (شبابش)
					اسم کی کئی قسمیں ہیں؟ دیکھئے جو کسی شخص، چیز یا جگہ کے نام کو اسم کہتے ہیں اور اس کی معنوں کے لحاظ سے دو قسمیں ہیں اسم معرفہ اور اسم مکررہ استاد جسمانی حرکات کا استعمال کر کے اسم کی قسمیں تختہ سیاہ پر لکھتا ہے
					ان کے نام درج ہیں چارٹ کا استعمال جس پر مختلف چیزوں، شخصوں وغیرہ کی تصاویر جمع دے گا۔ اساتذہ چارٹ دکھا کر بچوں کو آج اسم اور اس کی قسموں کے بارے میں جانکاری دے گا۔
					اسم کی کئی قسمیں ہیں؟ دیکھئے جو کسی شخص، چیز یا جگہ کے نام کو اسم کہتے ہیں اور اس کی معنوں کے لحاظ سے دو قسمیں ہیں اسم معرفہ اور اسم مکررہ استاد جسمانی حرکات کا استعمال کر کے اسم کی قسمیں تختہ سیاہ پر لکھتا ہے

SFI	مزید معلوماتی سوال	(PNVR)	غیر لسانی ہمت افزائی	CIS	آواز کا بدنام	(UPK)	سابقہ واقفیت	مہاتما گاندھی ایک خاص شخص، پہلا گم ایک خاص جگہ، القرآن ایک خاص کتاب وغیرہ	اُستاد سوال پوچھتا ہے کسی خاص شخص چیز یا جگہ کا نام بتائیے؟ (اُستاد اپنا سوال پوچھنے پر بھیجتا ہے)	اُستاد سوال پوچھتا ہے کسی خاص شخص چیز یا جگہ کا نام بتائیے؟ (اُستاد اپنا سوال پوچھنے پر بھیجتا ہے)
RF	توجہ مرکوز ہونا			(F) AVS	توجہ مرکوز اور سمعی و بصری وسائل کا استعمال			اُستاد چارٹ کا استعمال کر کے بچوں کو اسم خاص یا اسم معرفہ کے بارے میں اچھی جانکاری دے گا کہ کسی خاص شخص یا جگہ یا چیز کے نام کو گرامر میں اسم معرفہ کہتے ہیں مثلاً گاندھی جی، پہلا گم، القرآن وغیرہ	اُستاد چارٹ کا استعمال کر کے بچوں کو اسم خاص یا اسم معرفہ کے بارے میں اچھی جانکاری دے گا کہ کسی خاص شخص یا جگہ یا چیز کے نام کو گرامر میں اسم معرفہ کہتے ہیں مثلاً گاندھی جی، پہلا گم، القرآن وغیرہ	اُستاد چارٹ کا استعمال کر کے بچوں کو اسم خاص یا اسم معرفہ کے بارے میں اچھی جانکاری دے گا کہ کسی خاص شخص یا جگہ یا چیز کے نام کو گرامر میں اسم معرفہ کہتے ہیں مثلاً گاندھی جی، پہلا گم، القرآن وغیرہ
(ICA)	فکر انگیز یا تفہیمی سوال	(PVR)	لسانی ہمت افزائی	(PIS)	طلباء کی جسمانی شرکت کا استعمال			بچے: خاص نام ہر دہراتے ہیں جیسے گاندھی جی، پہلا گم، القرآن وغیرہ۔ بچے: سوچ کر کچھ اور نام اس طرح بتاتے ہیں: غلام محمد، انت ناگ، میرا قلم، وغیرہ	اُستاد بچوں سے یہ نام دہرانے کے لیے کہے گا۔ اُستاد بچوں سے کچھ اور نام بتانے کے لیے پوچھتا ہے جو اسم معرفہ ہیں	اُستاد بچوں سے یہ نام دہرانے کے لیے کہے گا۔ اُستاد بچوں سے کچھ اور نام بتانے کے لیے پوچھتا ہے جو اسم معرفہ ہیں

(اُستاد بچوں کو شاہ باغی دیتا ہے) آج اُستاد نے بچوں کو اسم معر فہ کے بارے میں تفہیمی جانکاری دی	اس کے بعد اُستاد دوسرا چارٹ پیش کرتا ہے جس پر عام اشیاء کے نام درج ہیں جیسے قلم، پنسل، کتاب، کرسی وغیرہ بچوں سے سوال پوچھتا ہے کہ چارٹ پر کون کون سی چیزیں ہیں؟ بچے دیکھ کر جواب دیتے ہیں (اُستاد بچوں کو تھکلی دیتا ہے)	اُستاد بچوں کی تصویر پر یا چارٹ کے ذریعہ سمجھاتا ہے کہ یہ چیزیں عام ہیں عام قلم کو ہم قلم کہتے ہیں۔ عام کتاب کو ہم کتاب کہتے ہیں۔ اس طرح مثالوں کے ذریعہ اُستاد بچوں کو اسم معر فہ
بچے! چارٹ دیکھ کر جواب دیتے ہیں کہ چارٹ میں مختلف اشیاء کے نام درج ہیں جیسے قلم، کتاب، کرسی اور پنسل وغیرہ	بچے! چارٹ دیکھ کر جواب دیتے ہیں کہ چارٹ میں مختلف اشیاء کے نام درج ہیں جیسے قلم، کتاب، کرسی اور پنسل وغیرہ	
	AVS (F) توجہ مرکوز اور سمعی و بصری وسائل کا استعمال	(F) AVS توجہ مرکوز اور سمعی و بصری وسائل کا استعمال
	(PNVR) غیر لسانی ہمت افزائی	

یعنی عام اسموں کے بارے میں	جانکاری دیتا ہے اور چند ایک بچوں کو	تختہ سیاہ پر کچھ عام نام لکھنے کے لیے	کے گا (اُستاد جسمانی حرکات کا استعمال کرتا ہے)۔	اُستاد دوسرے بچے سے کچھ اور نام حاصل کرنا چاہتا ہے جو اسم عام یا اسم نکرہ کہلاتے ہیں	(بہت خوب!) اُستاد مزید مثالیں اسم معرّف اور اسم نکرہ کے بارے بچوں سے حاصل کرنا چاہتا ہے اور ان کو تھوڑی دیر کے لیے سوچنے کی مہلت بھی دیتا ہے اس طرح اُستاد نے آج کا گرامر سبق ”اسم اور اس کی قسمیں“ بچوں کو اچھی طرح پڑھایا اور سمجھایا۔ شکریہ
بچے آگے آ کر ان میں سے	ایک بچہ تختہ سیاہ پر چند عام نام لکھتا ہے جیسے گاؤں، درخت، کاغذ وغیرہ	بچے کچھ اور نام بتاتے ہیں جیسے آدی، شہر وغیرہ			شکریہ
(PIS)	بچوں کی جسمانی شرکت کا استعمال				
R.D	علم حاصل کرنے کے لیے سوال آگے بڑھانا				
ICA	فکر انگیز اور تفہیمی سوال	(PVR)	لسانی ہمت افزائی		

اندازہ قدر یا جانچ کا تصور اور معنی

Concept and Meaning of Evaluation

امتحانات کی ابتداء زمانہ قدیم ہی میں ہو گئی تھی۔ انسان کے جب سے اپنے کاموں کی ابتداء ہوئی تب سے ان کاموں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کاموں کی کامیابی کا اندازہ لگانے کا کوئی نہ کوئی طریقہ نکالا ہے اور اس بات کی کوشش کی گئی کہ اسکولوں کی کامیابی کا اطمینان بخش ثبوت مہیا کیا جائے۔ کامیاب تدریس کا اندازہ لگانے کے لیے آلاتِ پیمائش کا استعمال ہونے لگا ہے۔ جن سے اعداد و شمار معروضی طور پر مل سکتے ہیں اور طلبہ کے کارناموں کی پیمائش مقداری طور پر کی جاسکتی ہے اور اسی طرح تدریس کی کامیابی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اندازہ قدر اور پیمائش کا فرق جاننا بہت ضروری ہے۔ اندازہ قدر سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ہماری تعلیمی کوشش پر سوچ سمجھ کر فیصلہ دیا جائے اس میں وہ طریقے طے کئے جاتے ہیں جن سے جانچ کی جاتی ہے۔ پیمائش کا تعلق ان آلات سے ہوتا ہے جن کی مدد سے کسی مجوزہ میدانِ عمل میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

روزمرہ کی تدریس کے دوران معلم وقتاً فوقتاً یونٹ ٹیسٹ یا ہفتہ واری ٹیسٹ لیتے ہیں۔ جن کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ طلبہ نے پڑھایا ہوا سبق کس حد تک سمجھ لیا ہے۔ اس سے معلم کے تدریسی طریقہ کی کمی کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ طلبہ کی ترقی کا اندازہ بھی لگتا ہے اس لیے ہمارے پورے تعلیمی نظام میں جانچ، امتحان اور طریقہ امتحان کا جاننا بہت ضروری ہے۔ جانچ اور امتحان کی

صورت حال اس طرح ہے:

جانچ (Test) امتحان (Examination) اندازہ قدر (Evaluation)

پیمائش (Measurement) جائزہ (Assessment)

بظاہر یہ تمام الفاظ ہم معنی لگتے ہیں امتحان کا پرچہ معلومات ناپنے کا آلہ ہے۔ امتحان یا جانچ وہ عمل ہے، جس کے ذریعے ہم تدریسی عمل کی کامیابی یا ناکامیابی کو جانچ لیتے ہیں۔ اندازہ قدر وہ رائے ہے جو آپ جانچ کر کے قائم کرتے ہیں۔ اصل مقصد ہمارا Evaluation ہوتا ہے۔ تدریس مقاصد کا حصول جمع کرنے، تجربہ کرنے اور تشریح کرنے کے مرحلوں کو اندازہ قدر کہتے ہیں۔

دورانِ تدریس معلم یہ جاننا چاہتا ہے کہ طلبہ کچھ سیکھ رہے ہیں یا نہیں اس کے لیے معلم اندازہ کرتا ہے اور اس اندازے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلبہ اپنی کمزوریاں دور کر سکیں اور بہتری کی طرف راغب ہوں۔ اس جانچ کو ہم تشخیصی جانچ بھی کہہ سکتے ہیں۔

مشہور ماہر تعلیم ”نائلز“ نے طلبہ کی شخصیت کے مندرجہ ذیل پہلوؤں کو شامل کیا ہے۔

(۱) علم (۲) تفہیم (۳) مہارت (۴) رجحانات (۵) ذہانت (۶) لیاقت یا

قابلیت (۷) دلچسپیاں

علم: طلبہ نے مضمون کا کتنا علم حاصل کیا ہے۔

تفہیم: طالب علم سیکھی ہوئی باتوں کو کس طرح بتا سکتا ہے۔

مہارت: زبان دانی میں لکھنے پڑھنے، بات چیت کرنے کی مہارت۔

رجحانات: سکولی زندگی اور عملی زندگی کے بارے میں رویہ، رجحان اور افتداری کا

جائزہ۔

ذہانت: نئے ماحول سے کس طرح مطابقت کی جائے اور کس طرح سے غلطیوں کو دہرانے سے بچا جائے۔

لیاقت یا قابلیت: طلبہ کی عام اور خاص قابلیتوں کی جانچ۔
دلچسپیاں: یہ جاننا کہ طلبہ کو کون کاموں، مضامین یا اشیاء سے دلچسپی ہے اور وہ کس طرح ان کی طرف بڑھتا ہے۔

ہمارا امتحانی سسٹم یہ جاننے کے لیے نہیں کہ بچے کو کتنا آتا ہے۔ ہمیں یہ اندازہ نہیں لگانا ہے کہ بچے نے کتنا سیکھا بلکہ یہ کہ ہم خود اسے سکھانے میں کتنے کامیاب ہوئے۔ نیز اس کا بھی اندازہ لگانا ضروری ہے کہ جس مواد کے ذریعہ ہم جو کچھ سکھانا چاہتے ہیں وہ مواد بھی کافی ہے یا نہیں۔ پھر یہ کہ جو وہ پڑھ رہے ہیں وہ مقاصد حاصل کرنے کے لیے کافی ہیں یا نہیں۔

یہ بات اب صاف ہو گئی کہ (Evaluation) اندازہ قدر وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم کسی چیز کو جانچنا اور پرکھنا چاہتے ہیں۔ یہ پیمائش ہم درس و تدریس کے تناظر میں امتحانی پرچہ سے کرتے ہیں۔ امتحان اور جانچ کے نتیجے میں جو رائے قائم کی جاتی ہے وہی اندازہ قدر کہلاتا ہے۔ اسکی ضرورت ہمیں ہر جگہ اور ہر وقت پڑتی ہے جب بچہ سکول میں داخل ہوتا ہے تو داخلہ کے سلسلہ میں جو اس کی جانچ کی جاتی ہے وہ اسی ضمن میں آتی ہے۔ اس کی معلوماتی استعداد کے علاوہ اس کی ذہنی جانچ بھی کی جاتی ہے۔ تحریری اور زبانی دونوں طرح سے اس کے معیار کو معلوم کیا جاتا ہے۔

جانچ کے لیے سوالات اور ٹیکنیک استعمال کی جاتی ہیں جن سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ بچے میں آموزشی سطحیں کیا کیا ہیں اور کہاں کہاں ہیں۔

۱۔ طلبہ کو اپنی اچھائیوں، کمزوریوں اور خامیوں کا علم ہوتا ہے تو وہ انہیں دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۲۔ طلبہ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی لیاقت میں کتنا اضافہ ہو رہا ہے اور خامیوں کی کتنی اصلاح کی گئی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تعلیم ہی ان کی اصلاح کر سکتی ہے۔

۳۔ طلبہ کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ پڑھائی میں کس سطح تک آتے ہیں۔

۴۔ طلبہ میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

۵۔ معلم کو اپنے تدریسی طریقوں کی افادیت کے بارے میں فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

۶۔ اگر طلبہ کو اُن کے اندازِ فکر سے کوئی فیض نہیں پہنچتا تو انہیں اپنی کوتاہی، لاپرواہی

اور بے احتیاطی کا احساس ہوتا ہے اور وہ آئندہ کے لیے محتاط رہتے ہیں اور

نئے طریقوں کو اختیار کر کے تعلیمی مقاصد کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۷۔ تدریسی و اکتسابی نتائج سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔

مندرجہ بالا مقاصد و فوائد معنی اور تصور کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں سائنسی نقطہ

نظر رکھنے کی ضرورت ہے جس سے تمام تعلیمی اور تدریسی مقاصد حاصل ہو جائیں

گے اور اندازہ قدر (evaluation) کا کامیاب تجربہ رہے گا۔

خطا تجزیہ اور اصلاحی تدریس

(Error analysis and remedial teaching)

اردو زبان کو نہ صرف برصغیر ہی میں مقبولیت ہے بلکہ یہ زبان ایک ملک گیر زبان مانی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ زبان تمام دنیا کی بڑی بڑی زبانوں کے صف میں شامل ہے۔

چونکہ اردو زبان ایک ملی جلی زبان ہے اس میں مختلف زبانوں کے حروف و الفاظ اور اصطلاحات، مرکبات، قواعد، تشبیہات و استعارات اور صنائع و بدائع وغیرہ شامل ہیں اس لیے ان کے پڑھنے اور لکھنے میں بچوں کو دقتیں پیش آتی ہیں۔ یہاں تک کہ اردو مدرسین سے بھی اکثر اس کے بولنے اور لکھنے میں مشکلات آتے ہیں۔ اس زبان کے بولنے میں علاقائی اثر بھی ہے۔ ملک میں کچھ علاقوں کے لوگ اُردو ایک طرح سے بولتے ہیں اور کچھ علاقوں کے لوگ اپنے ماحول کے مطابق اردو بولتے ہیں۔ جیسے دہلی کی اردو زبان اور لکھنؤ کی اردو زبان بولنے میں بہت فرق ہے۔ اسی طرح جنوبی ہندوستان (حیدر آباد دکن) اور شمالی ہندوستان (دہلی) کے اردو میں بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ خود اُردو والے کہتے ہیں کہ اُردو پڑھنا اور لکھنا مشکل ہے یہ اس لیے کہ طلبہ کو زیادہ تر ابتدائی اور ثانوی سطحوں پر اردو پڑھانے اور سکھانے کی صحیح اور درست تربیت نہیں ملتی ہے۔ طلباء اکثر اردو لکھنے اور بولنے میں غلطیاں کرتے ہیں۔ نہ صحیح بولتے ہیں اور نہ درست لکھتے ہیں۔ وجہ یہ کہ اُن کو صحیح رہنمائی نہیں ملتی ہے۔ یہ پہلے بھی بیان کیا گیا اردو کا رسم الخط فارسی زبان کا رسم الخط

ہے جو کہ اعراب کے بغیر ہے۔ اسی طرح اردو گرائمر کے سمجھنے میں طلبہ کو دو تین پیش آتی ہیں اور گرائمر غلط استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر تذكیر و تانیث کا مسئلہ۔ ہم کشمیری زبان کو اردو میں ترجمہ کرتے ہیں اور اردو کو بعض اوقات کشمیری زبان میں بول کر ہم اردو زبان کی ناک کاٹتے ہیں مثلاً چاند نکلی جو کہ تذكیر و تانیث کے حساب سے غلط ہے اور چاند نکلا درست ہے۔ اسی طرح بہت سے الفاظ اور محاورے یا جملے وغیرہ کشمیری زبان سے ترجمہ کر کے اردو میں بولنے کی کوشش کرتے ہیں جو سراسر غلط ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہم اردو زبان صحیح طور بول نہیں سکتے ہیں اور بولنے میں یہاں تک کہ لکھنے میں بھی خطا ہو جاتی ہے۔ یہ خطا بچوں میں پہلے سے ہی موجود ہوتی ہے کیونکہ تحتانوی سطح پر بچوں کو اردو کے تربیت یافتہ اُستاد نہیں ملتے ہیں جس وجہ سے طلبہ میں یہ کسریا کی موجود رہتی ہے اُردو استاد اگر کہیں بھی میسر ہو تو وہ اُن پرانے اور روایتی طریقوں کو استعمال کر کے پڑھاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ صحیح اور فصیح اردو نہ بول سکتے ہیں اور نہ پڑھ سکتے ہیں۔ لکھنے کی رکاوٹ اس سے مشکل ہے۔ غرض ایسے بہت سے مسائل اردو طلبہ کو درپیش آتے ہیں جن کی وجہ سے وہ اکثر غلطیاں کرتے رہتے ہیں یا انہیں غلطیوں کا احتمال رہتا ہے۔ اردو میں ڈگریاں حاصل کر کے بھی اردو لکھنے اور پڑھنے میں اُن کو مسائل درپیش آتے ہیں۔ ان تمام مسائل کی زیادہ ذمہ داری اُردو اساتذہ پر ہے۔ چند مسائل یا غلطیوں کا ذکر مندرجہ ذیل ہے۔

تذكیر و تانیث کی غلطیاں: اس کا ذکر پہلے ہی تو آچکا ہے پھر بھی چند مثالیں پیش ہیں:

اردو زبان میں گرائمر استعمال کرتے وقت حقیقی اور غیر حقیقی تذكیر و تانیث کا مسئلہ ہے یعنی جاندار اور بے جان چیزوں کی تذكیر و تانیث غلط استعمال کئے جاتے

ہیں۔ جیسے: کام، چاند، زمین، جمعہ وغیرہ ایسے الفاظ جن کے جملوں میں استعمال کرتے وقت غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح واحد اور جمع میں بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ تصحیح الفاظ یعنی غلط جملے اور درست جملے لکھتے وقت یا بولتے وقت غلط ہونے کا امکان ہے جیسے اردو میں رومال مذکر ہے لیکن کشمیری زبان میں اسے مونث سمجھا جا رہا ہے۔ مثلاً میرا رومال سرخ ہے ٹھیک ہے جب کہ میری رومال سرخ ہے غلط۔ اسی طرح بہت سے الفاظ اور جملے غلط طور استعمال کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح اردو میں ہم تلفظ یا متشابہ الفاظ کا مسئلہ بھی ہے جن کے بولنے اور لکھنے میں غلطیاں ہو جاتی ہیں جیسے:

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
ابد	ہمیشہ	عبد	بندہ
ارض	زمین	عرض	درخواست، چوڑائی
اقل	چھوٹا	عقل	دانائی
سدا	ہمیشہ	صدا	آواز

اسی طرح کثیر المعانی الفاظ کا مسئلہ:

الفاظ	معنی (کثیر)	الفاظ	معنی (کثیر)
چاہ	کنواں، محبت	ماہ	مہینہ، چاند
آں	عزت، گھڑی	نشان	علامت، جھنڈا
بیت	گھر، شعر	دام	جال، قیمت

ہم جنس الفاظ کا مسئلہ:

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
خیم	ٹیوٹا	خیم	شراب

ملک	فرشتہ	ملک	بادشاہ
گل	پھول	گل	کیچڑ، مٹی

اسی طرح جے اور اِ ملا کی غلطیاں جیسے:

اسلم امتحان میں فعل ہو گیا اسلم امتحان میں فیل ہو گیا

سلام کے بعد واضح ہو سلام کے بعد واضح ہو

وغیرہ وغیرہ مثالیں پیش کی جائیں۔

اس قسم کی غلطیوں کے نتیجے میں اردو طلبہ کی گفتگو اور تحریر اردو زبان کی جبین پر ایک داغ بن کے رہ جاتی ہے۔ شاید یہی حال ان خطوں کا بھی ہو گا جہاں کے رہنے والوں کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔

”چند تدریسی اصلاحات“

اس قسم کی غلطیوں سے طلباء کو بچانے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں اردو زبان سکھانے میں گرائمر کے اصولوں سے پوری مدد لی جائے۔ اُستاد کو اس کام میں یہ احتیاط برتنا چاہیے کہ تعلیم زبان ہے۔ گرائمر کو الگ نہ کیا جائے۔ مطلب یہ کہ اگر گرائمر پڑھانے کا کوئی الگ وقت مقرر نہ کیا جائے بلکہ بچوں کو عام تحریر یا تقریر میں اُستاد جہاں کہیں اور جب کبھی غلطی دیکھ لے فوراً درستی کر لے۔ اصلاح کا کام ٹھیک اسی طرح ہونا چاہیے جس طرح گھر میں غلط بولنے والے بچے کو اپنے والدین یا بزرگ غلطی کی بروقت درستی کر کے صحیح لفظ بولنا یا فقرہ ادا کرنا سکھاتے ہوئے ایسے دو فقرے کہہ ڈالتا ہے جس کا ترجمہ یوں ہے:

(۱) نیل بیٹھ گئی (۲) گائے دودھ دیتا ہے۔

تو کیا اس کے والدین اُسی دم درستی کر کے اُس سے یوں نہیں کہلوائیں گے:

(۱) نیل بیٹھ گیا (۲) گائے دودھ دیتی ہے۔

کر سکیں۔ اور سنی ہوئی کہانیوں کا نچوڑ اپنے الفاظ میں قلمبند کر سکیں۔

بیان کئے گئے اصلاحات و تدابیر کے مطابق اگر طلباء کو اپنی تحریری کاوشیں اسی باقاعدگی کے ساتھ جاری و ساری رکھی جائیں نیز مدرس بھی بچوں کو اس بارے میں مدد اور سہولیت بہم پہنچائے تو یقیناً کم سے کم وقت میں ان کے اظہار خیال کی قوت اور تحریری و تقریری غلطیاں درست ہو جائیں گے۔ تو اُس صورت میں اُستاد کو سمجھنا چاہیے کہ بچوں کو صحیح زبان بولنے اور لکھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ بقول اقبالؒ

نہیں ہے نا اُمید اقبالؒ اپنی کشتِ ویران سے
ذرا غم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اچھی زبان فہمی آزمائش کا معیار

(Criteria of a good language test)

آزمائش کی تعریف— (Definition of Test)

امتحان کے نفسیاتی دباؤ کی وجہ سے اکثر اوقات طلبہ کے طرز عمل کی تبدیلیوں کے بارے میں مناسب نتائج اخذ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ طلبہ کی مخفی خواہشات، جذبات اور ان کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کا علم اس وقت ہوتا ہے جب وہ کاموں میں مصروف ہوتے ہیں۔ اس لیے امتحان کو نظر انداز کر کے دوسری ٹیکنیک کو کام میں لایا گیا ہے۔ تعلیم و تدریس کے متعین مقاصد کی تکمیل کے نتائج کو جانچنے کا نام آزمائش ہے۔ امتحان، آزمائش اور جانچ یہ تینوں اندازہ قدر اور طلباء کی لیاقت کو پرکھنے کے ذرائع ہیں۔ ان میں بہت تھوڑا فرق ہوتا ہے۔ امتحان (Examination) بڑی چیز ہے۔ آزمائش (Test) مختصر طریقہ ہے۔ آزمائش کو بروئے کار لانے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ طریقہ امتحان طلبہ کی صلاحیتوں کی صحیح پیمائش کرنے میں ناکام رہا۔ امتحان کو طلبہ کو جانچنے کا پیمانہ ہے اب اگر پیمانہ غلط ہے تو جانچ بھی غلط ہوگی۔ اقدار کی جانچ کا طریقہ بھی ہمارے پاس نہیں اس لیے تعلیم کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے آزمائش کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ جو بہت کامیاب ہے۔ اور یہیں سے معروضی آزمائش کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جانچ کا سب سے صحیح، آسان اور انداز قدر کی پیمائش کو پورا کرنے

کا ذریعہ ہے۔ اس طرح آموزشی تجربات کے ذریعے تعلیمی مقاصد بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔

اُردو زبان و ادب کی مقبولیت کے پیش نظر اس زبان کی طرف آج کل طلبہ راغب ہوتے جاتے ہیں اور روز بروز درس و تدریس کے نئے طریقے معرض وجود میں آتے رہتے ہیں مگر جہاں اچھی زبان فہمی کا تعلق ہے۔ اس میں ابھی بھی وہی پرانے طریقے استعمال کئے جاتے ہیں اور پرانے طریقوں سے زبان فہمی کا معیار پرکھا جاتا ہے جس سے طلبہ کا ذہن پر کھنے اور جانچنے میں کافی دقت آتی ہے اور طلبہ پر اس کا برا اثر پڑتا ہے اور طلبہ بغیر سمجھ نوٹ کورٹ لگا کر زبانی یاد کر کے امتحان کے وقت وہی لکھا کرتے ہیں جو کہ فضول اور بے سود بنتا ہے اور ان میں تخلیقی قوت بالکل پیدا نہیں ہوتی ہے اور نہ مطالعہ کی نوبت آتی ہے اس لیے ایک اچھے معلم اُردو معلوم کو چاہیے کہ وہ طلبہ کو اس عادت سے چھٹکارا دلوا کر طریقہ امتحان میں بھی تبدیلی لائے اور آزمائش (Test) کا طریقہ اختیار کیا جائے تاکہ صحیح معنوں میں طلبہ کی ذہنی آزمائش ہو جائے اور زبان فہمی کا اندازہ کیا جائے۔

اچھی زبان فہمی آزمائش کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

- ۱۔ پڑھائے ہوئے سبق کی آزمائش لی جائے۔ اس سے باہر سوال نہ پوچھا جائے
- ۲۔ چونکہ کلاس میں طلبہ مختلف الذہن ہوتے ہیں۔ اچھے، اوسط اور کمزور اس لیے آزمائش لیتے وقت ایک اُردو معلم کو ان طلباء کے ذہنوں کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔

- ۳۔ آزمائش کی ہر مشق طلبہ کے معیار کے مطابق ہوتا کہ اوسط اور کمزور طلبہ بھی سوالنامہ سمجھیں اور لکھ سکیں۔

- ۴۔ آزمائش مرتب شدہ سیلیبس کے مطابق ہو غیر ضروری سوالات پوچھنے سے

پر ہیز کیا جائے۔

۵۔ سوالنامہ معیاری ہونہ آسان اور نہ مشکل۔

۶۔ متضاد سوالات پوچھنے سے بھی پرہیز کیا جائے یعنی سوالات ایسے ہوں جن کے جواب میں کوئی تضاد نہ ہو۔

۷۔ سوالنامے پر ہدایات صاف اور واضح طور پر دئے جائیں تاکہ امتحانی امیدوار کو یہ صحیح پتہ چلے کہ انہیں کس طریقہ سے سوالات کے جوابات لکھنے ہیں۔

۸۔ سوالنامے میں نمبرات کی تقسیم بالکل واضح ہو۔

۹۔ اچھی زبان فہمی کی آزمائش کے لیے معروضی سوالات پوچھے جائیں جن سے طلباء کے ذہنوں کا صحیح ٹیسٹ ہو جائے اور یہ طریقہ نہایت جدید سمجھا جاتا ہے اور معروضی آزمائش موضوعی آزمائش کی ضد ہے۔ موضوعی جانچ میں امتحانی امیدوار جواب طویل بنانے کے لیے غیر ضروری باتیں لکھتا ہے اس کے برعکس معروضی آزمائش میں ایسا نہیں ہے۔

۱۰۔ زبان فہمی کی اس آزمائش سے طالب علم کی متعلمانہ کارکردگی جانچی جاتی ہے اور اس کی علمی استعداد کا پتہ لگتا ہے۔

۱۱۔ ممتحن (Examiner) بھی اس کی جانچ اچھی طرح کرتا ہے اور طالب علم جانچنا اس کے لیے آسان بنتا ہے اور وقت بھی کم صرف ہوتا ہے۔

معروضی امتحان جدید اور سائنٹفک ہیں اس میں طالب علم کو ایک مخصوص اور مختصر سا جواب دینا ہوتا ہے یا اسے محدود جوابات میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ اس سے طالب علم کے مختلف علمی پہلوؤں کی جانچ سہولت کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔ یہ آزمائش معلومات کی چھوٹی اکائیوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اس

میں اکتسابی مواد کی شناخت کی جاتی ہے۔ اس آزمائش میں طلباء خود کچھ نہیں لکھتے ہیں بلکہ تحریر کردہ جوابات سے صحیح جواب کی شناخت کرنی ہوتی ہے۔ اس طرح اس آزمائش سے پورے نصاب کا احاطہ کیا جاتا ہے اور طلبہ کی حاضر دماغی اور ذہنی صلاحیت کا بخوبی تجزیہ کیا جاتا ہے۔ بعض سوالات کی عبارت میں خالی جگہوں میں کوئی مناسب اور صحیح لفظ دریافت کیا جاتا ہے یا چند الفاظ خود پیش کر دئے جاتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک لفظ کو خالی جگہ میں لکھنے کو کہا جاتا ہے۔

زبان فہمی آزمائش کی قسمیں

(Types of Language Test)

معروضی جانچ کے ذریعے طالب علم کے وقوفی پہلوؤں کی جانچ سہولت کے ساتھ کی جاسکتی ہے اور اس بات کا پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ طالب علم مضمون کے بنیادی عناصر کا کتنا علم رکھتا ہے اور واقعات، اصطلاحات اور تصورات سے کس حد تک واقف ہے۔ اس لیے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی منزل پر معروضی آزمائش کے ساتھ ساتھ مختصر جواب آزمائش کا استعمال ضروری ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کی تیاری کے سلسلے میں زبان فہمی آزمائش چند اقسام میں تقسیم ہے۔ عام طور اس کے چار اقسام ہیں ان کو مدات بھی کہتے ہیں۔ ان کا ذکر درج ذیل ہے:

(۱) متبادل جواب مدات یا صحیح و غلط (False True)

اس میں بہت سے بیانات دئے جاتے ہیں اور طالب علم کو اس کی صحت یا عدم صحت کی نشاندہی کرنی ہوتی ہے۔ طلبہ صحیح بیان کے یا مواد کے آگے صحیح کا نشان (✓) اور غلط مواد کے آگے غلط کا نشان (X) لگا دیتے ہیں۔ اس طرح کے سوالات کو واقعات اور تصورات وغیرہ کی جانچ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس آزمائش میں ان کی اکتسابی معلومات کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ ان کی حاصل کردہ معلومات کہاں تک درست ہیں۔

(۲) کشیر الانتخابی آزمائش یا تعددی انتخاب مدات (Multiple Choice)

اس آزمائش میں امتحان ایک سوال کے کئی جواب خود تحریر کرتا ہے۔ طلباء ان جوابات میں سے صحیح کا انتخاب کرتے ہیں اور اس پر نشان لگاتے ہیں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا۔ یہ ترانہ لکھنے والا

(۱) غالب (۲) میر (۳) اقبال (۴) جوش

(۳) تکمیلی آزمائش یا تکمیلی مدات (Completion Test)

اس میں امتحان سوال یا بیان میں نامکمل جملہ تحریر کرتا ہے اور جگہ چھوڑ دیتا ہے۔ طلبہ اس کو پُر کرتے ہیں۔ اور چند الفاظ کی فہرست بناتا ہے جن کو مناسب جگہوں میں پُر کرنے کے لیے کہا جاتا ہے مثال: بال جبریل، ہندوستان، قلم۔

(۱) ہمارے ملک کا نام..... ہے۔

(۲) اقبال کی کتاب کا نام..... ہے۔

(۳) کا لکھنا ہے۔

(۴) مقابلہ یا تعلق کی آزمائش یا مماثلت (Matching Test)

اس میں ایک طرف سوالات یا بیانات تحریر کردئے جاتے ہیں اور دوسری طرف جوابات مگر ترتیب بدل دی جاتی ہے۔ اب آپ کو صحیح بیان کے آگے صحیح ترتیب پر نشان لگانا یا ملانا ہے: مثال:

(الف)	(ب)
(۱) علی گڑھ یونیورسٹی کا بانی	الطاف حسین حالی
(۲) مُسدس کا لکھنے والا	سرسید احمد خان
(۳) آبِ حیات	مسعود حسین خان
(۴) تاریخ زبان اُردو	مولانا محمد حسین آزاد
(۵) عود ہندی	ابوالکلام آزاد
(۶) غبارِ خاطر	غالب

آج کے دور میں یہ آزمائش سب سے اہم مانی جاتی ہے۔ ملک میں جتنے بھی مقابلہ جاتی امتحان ہوتے ہیں۔ اس میں اسی سے کام لیا جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ امتحان میں ہم اگر سب طریقوں کو ملا کر طلبہ کی لیاقت کی جانچ کریں تو شاید تعلیمی نظام کی کامیابی کا ضامن ہو۔



UNIT V

Content

یونٹ (۴) ”کنٹنٹ“

پانچواں حصہ۔ پانچویں اکائی

”مشمولات“

آدمی زادہ طرفہ معجون است
از فرشتہ سرشتہ و ز حیوان

گر گند میل این شود کم زین
ور گند میل آن شود بہ زان
علامہ اقبال

علی گڑھ تحریک کے علمی اور ادبی کارنامے

علی گڑھ تحریک دراصل سرسید کے اُس خواب کا نام ہے جس کی تعبیر ہمیں آج مسلمانوں کی زندگی کے مختلف شعبوں میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی خاموش تحریک تھی جو ایک بے لوث انسان اور مسلم قوم کے مخلص رہنما سرسید احمد خان کی بے مثال قربانی اور انتھک محنت و جانفشانی کے ساتھ شروع ہوئی تھی۔ ابتداء میں سرسید احمد خان نے اپنی جدوجہد کو انفرادی سطح پر شروع کیا تھا مگر رفتہ رفتہ بہت سے خادمانِ قوم سرسید کی رہنمائی میں آتے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ جذبہ خدمت ایک تحریک کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔

انیسویں صدی کے آغاز کے ہی ہندوستان میں انگریزوں نے اپنا اثر و رسوخ بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ اور ہندوستان کی انتظامیہ میں انگریزوں کا عمل دخل بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ اس طرح انگریزوں کے ہاتھوں مغلوں کا تخت سے ہٹایا جانا، مسلمانوں کو خود اپنی شکست کے مترادف محسوس ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان احساسات نے ۱۸۵۷ء میں غدر کی شکل اختیار کی۔ اس سلسلے میں سرسید احمد خان نے غدر سے کوئی دس سال پہلے ”آثار الصنادید“ مکمل کر لی تھی۔ اور اس کتاب کے ذریعے دہلی کے تاریخی عمارتوں کا تاریخی اور تحقیقی جائزہ لیا تھا۔ غدر کے بعد سرسید کے سامنے ہندوستان کی مستقبل کی بہت واضح تصویر آچکی تھی۔ انہوں نے بڑے

غور و خوض اور تجزیے کے بعد یہ رائے قائم کی تھی کہ اب مسلمانوں کی بھلائی صرف اس میں ہے کہ وہ انگریزوں کے ساتھ معاندانہ رویے کے بجائے مفاہمت کا انداز اختیار کریں، انگریزوں میں جو خوبیاں ہیں ان کو اپنائیں اور ان کے علوم و فنون کو حاصل کر کے سیاسی اور سماجی طور پر اپنی پوزیشن مضبوط کریں۔ چنانچہ ۱۸۶۳ء میں سرسید نے غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی زبان کی اعلیٰ، علمی، تہذیبی اور سائنسی کتابوں کا ترجمہ کیا جائے۔ اور ان لوگوں کو اس سرمائے سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جائے جو براہ راست انگریزی زبان کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کر سکتے تھے۔

سرسید کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ ویسے تو عرصہ دراز سے جاری رہا لیکن سائنٹفک سوسائٹی کا قیام ہی صحیح معنوں میں علمی گڑھ تحریک کے علمی اور ادبی کارناموں کا نقطہ آغاز ہے۔ اس لیے کہ اس سوسائٹی کے جو مقاصد اس وقت پیش نظر رکھے گئے تھے بنیادی طور پر وہی مقاصد سرسید اور ان کے رفقاء علمی و ادبی کارناموں اور عملی جدوجہد میں عرصہ دراز تک کارفرما ہے۔

سرسید کے مقاصد کو اگر مختصر طور پر بیان کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو زندگی کے سارے میدانوں میں انگریزوں کی طرح ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس بات کے معترف تھے کہ مسلمانوں نے اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھلا دیا ہے۔ وہ مذہب کے غلط تشریحات کے سبب مذہبیت کو دقیانوسیت کی ایک شکل کے طور پر اپناتے ہیں۔ سرسید یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ علمی اور سماجی ترقی مذہب کی تعلیمات کے منافی نہیں ہے۔ اسلام نے کہیں بھی پسماندگی اور دقیانوسیت کی تعلیم نہیں دی، وہ علم کے حاصل کرنے کے بارے میں رسول کریم ﷺ کی احادیث و اوقاف آئیں کہ ہم کی آیتوں پر بہت توجہ دیتے تھے۔

اور مسلم عوام میں یہ احساس بیدار کرنا چاہتے تھے کہ علمی ترقی کے بغیر دنیا میں کوئی مقام حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے سرسید نے سب سے زیادہ علمی کاموں کی طرف توجہ دی۔ مسلمانوں میں تعلیم کے عام کرنے اور نئی نسل کی ذہنی تربیت کے لیے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی جو جنوری ۱۸۷۷ء کو ایم اے او کالج کی شکل میں تبدیل ہوا اور عرصہ دراز کے بعد ۱۹۳۰ء میں یونیورسٹی کی شکل اختیار کی۔ مدرسۃ العلوم یا ایم اے او کالج (مچھن اینگلو اورینٹل کالج) کے قیام سے جہاں سرسید نے نئی نسل کی تعلیم و تربیت کی نہج تبدیل کی وہیں اپنی تصنیفات کے ذریعے مسلم عوام کا مزاج بدل ڈالا۔ سرسید کے اثر سے ان کے رفقاء اور بعض ایسے مصنفین بھی اس جدوجہد میں شریک ہو گئے۔ جو بظاہر سرسید کے رفیق کار نہ تھے مگر جذبہ خدمت سے سرشار ضرور تھے۔ چونکہ علی گڑھ تحریک کے علمی اور ادبی کارناموں کا سلسلہ ان گنت تصنیفات اور ایک طویل زمانے پر پھیلا ہوا ہے۔ یہاں سرسید اور اُن کے قافلے میں شریک صرف نمایاں ترین علماء اور ادیبوں کے کارنامے کے ذکر تک اپنی بات محدود رکھیں تو زیادہ مناسب ہے۔

سرسید غدر سے پہلے ”آثار الصنادید“ کے علاوہ کئی علمی اور مذہبی کتابیں لکھ چکے تھے۔ مگر غدر کے بعد ان کی تصنیف و تالیف کے کام میں زیادہ تیزی آ گئی۔ انہوں نے غدر کے واقعہ کا تفصیلی تجزیہ ”اسباب بغاوت ہند“ نام کی کتاب لکھی۔ اسی زمانے میں سرسید نے آئین اکبری، تہذیب و تہذیب اور تاریخ فیروز شاہی کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ تاریخ سرکشی بجنور لکھی۔ اور ۱۸۷۰ء میں انگلستان سے واپس آ کر ”تہذیب الاخلاق“ نکالا۔ اس رسالے نے سرسید کے موافقین اور مخالفین کو سامنے آنے کا موقع فراہم کیا۔ تہذیب الاخلاق کے ذریعے ہی سرسید نے علمی تحریک کی بنیادیں مستحکم کیں۔ اسی زمانے میں تصانیف و تصانیف

کی زبان کے معیار اور رنگین طرز تحریر کو بدلا۔ اور اسی کے مضامین کے ساتھ عام فہم، سادہ اور بے تکلف نثر لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ عبارت آرائی اور رنگینی سے احتراز کیا گیا۔ مبالغہ آمیز انداز تحریر سے نجات حاصل کی گئی۔ حقیقت، مقصدیت اور تعقل پسندی کو راہ دی گئی۔ سر سید احمد خان نے ایک بار اپنے مقاصد بیان کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ ہم نے اپنی قوم کو دکھایا ہے کہ مضمون لکھنے کا کیا طریقہ ہے اور ہماری زبان میں ان خیالات کے ادا کرنے کی کیا طاقت ہے۔ اگر اس تحریک کو مختصر اچار مقاصد میں تقسیم کیا جائے تو کوئی غلط نہ ہوگا۔

۱۔ انگریزوں سے علم و ہنر، تہذیب و تمدن اور اخلاق و آداب میں استفادہ کیا جائے اور مسلمانوں کو انگریزوں کو ہم سر بنایا جائے۔

۲۔ انگریزوں کی اعلیٰ علمی کاوشوں کا ترجمہ اردو زبان میں پیش کیا جائے اور اس سے مسلمانوں کو استفادہ کا موقع فراہم کیا جائے جو براہ راست انگریزی نہیں پڑھ سکتے۔

۳۔ غیر مسلموں کے اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات کا مستند اور مدلل جواب دیا جائے۔

۴۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے مدرسۃ العلوم کو منفرد طرز کی تعلیم گاہ بنایا جائے اور تہذیبی طور پر ان کی پسماندگی دور کرنے کے لیے اسلاف کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے اور نئی تحریروں کے ذریعے ان کی ذہنی تربیت کی جائے اور علمی بیداری پیدا کی جائے۔

سر سید نے اپنی تحریروں اور عمل کے ذریعے ان مقاصد کو عام کرنے کی کوشش کی اور بہت بڑی حد تک اپنی زندگی میں کامیابی حاصل کی۔ اُن کی علمی، مذہبی اور

ٹیوٹ گزٹ کے مضامین کے علاوہ قرآن کی تفسیر جو نامکمل رہ گئی، تحقیق لفظ نصاریٰ اور خطبات احمدیہ وغیرہ بہت اہم اور مشہور تصانیف ہیں۔

سر سید احمد خان نے کہنے کو تو اپنے کام کا آغاز تنہا کیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک قافلہ سالار تھے جو سفر کے لیے تو اکیلا نکل کھڑا ہوتا ہے مگر اسکی صلاحیتیں اور جذبہ خلوص پورے کاروان کو اپنے پیچھے آنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سر سید احمد خان بھی ایک ایسے ہی میر کاروان تھے کہ ان کے ساتھ حالی، شبلی، وقار الملک، محسن الملک، ذکاء اللہ جیسے مختلف علوم و فنون کے ماہرین قدم سے قدم ملا کر چلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ڈپٹی نذیر احمد اور چراغ علی جیسی باکمال شخصیتیں ان سے کمال عقیدت کا اعتراف کرتیں اور اپنے آپ کو سر سید کے مقصد سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو انفرادی طور پر بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں اور مختلف علوم و فنون میں اپنی مثال آپ ہیں مگر ان کی تصانیف اور کارناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر سر سید کے اس خواب کی تعبیریں ڈھونڈ رہے ہیں جو کبھی سر سید نے دیکھا تھا اور اسے تادم حیات شرمندہ تعبیر کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتے تھے۔ سر سید کے اُن رفقاء میں علمی اور ادبی کارناموں کے لحاظ سے حالی، شبلی، ذکاء اللہ اور نذیر احمد نے خصوصیت کے ساتھ صحافت، سوانح نگاری، تاریخ نویسی، مضمون نگاری، تنقید، فکشن اور مذہبیات میں نمایاں خدمت انجام دیں۔ ان اصناف میں سے اکثر اصناف ایسی ہیں جن میں سر سید احمد خان خود بھی دخل رکھتے تھے اور ان کے ابتدائی نقوش سر سید کے ہی انقلاب پسند مزاج کے مرہون منت تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اصناف اردو میں پہلے سے موجود تھیں مگر ان سب میں جدید طرز کی بنیاد سر سید نے ڈالی اور ان کے رفقاء نے اکثر اصناف کو نقطہ عروج پر پہنچا دیا۔

الطاف حسین حالی

حالی صاحب ان باکمال لوگوں میں سے ہیں جن کو غالب کی شاگردی اور سرسید سے کسب فیض کرنے کا موقع ملا۔ وہ عربی، فارسی کے جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ، شاعر، سوانح نگار اور نقاد بھی تھے۔ سرسید کی تحریک میں عورتوں کی طرف زیادہ توجہ نہ دی گئی تھی۔ حالی نے ”محاسن النساء“ لکھ کر اس تحریک کی ایک خاص کمی کو پورا کیا۔ حالی نے مولانا محمد حسین آزاد کے اشتراک سے لاہور میں ”جدید نظم“ کی تحریک شروع کی اور نظم گوئی کو موضوعاتی طور پر متعین کر کے اس صنف شاعری سے اصلاح کا کام لینے کی تبلیغ کی۔ یہ بھی سرسید کی تعلیمات کا ایک حصہ تھا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ”مسدس مدو جزا اسلام“ بھی ہے جو آج مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے۔ اس طویل مسدس نظم میں مسلمانوں کے عروج کی داستان بیان کر کے موجودہ حالت سے اپنی قوم کو عبرت حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ مسدس کی افادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سرسید نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ ”جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا، میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوالا یا ہوں اور کچھ نہیں۔“

تنقید کے میدان میں ”مقدمہ شعر و شاعری“ لکھ کر اردو کی ادبی تنقید کے لیے اصول وضع کر دئے۔ ”شعر و شاعری“ میں حالی نے مشرقی طرز کے سارے عناصر کو قبول کرتے ہوئے مغربی تنقید کی بعض بنیادوں کو بھی اپنی ادبی تنقید کا حصہ بنا لیا ہے۔ اصول سازی کے علاوہ ”مقدمہ“ میں اردو شاعری کے قدیم سرمائے پر عملی تنقید کر کے حالی نے عملی تنقید کے ایسے نمونے ہمارے لیے چھوڑے ہیں جن کی قدر و قیمت آج بھی کم نہیں ہوئی۔

سوانح نگاری حالی کا خاص میدان تھا۔ حالی نے غالب، سعدی اور سرسید پر

بالترتیب یادگار غالب، حیات سعدی اور حیات جاوید لکھ کر اردو سوانح نگاری کو ایک اعتبار بخشا۔ سوانح نگاری کو حالی کیا سمجھتے تھے۔ اس کا اندازہ خود حالی کے اس جملے سے لگایا جاسکتا ہے۔ ”بیاگرانی بزرگوں کی ایک یادگار ہے وہ قومیں جنہوں نے ترقی کے بعد تنزل کا منہ دیکھا ان کے لیے یہ ایک تازیانہ ہے جو اُن کو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے۔“

مولانا شبلی نعمانی

شبلی سرسید کے اُن رفقاء کار میں سے تھے جنہوں نے باضابطہ سرسید کے کالج میں اُستاد کی حیثیت سے تعلیم دی تھی۔ وہ اپنے کسی عزیز طالب علم سے ملنے علی گڑھ آئے تھے۔ اسی زمانے میں ان کی ملاقات سرسید سے ہوئی۔ سرسید نے ان کو اپنے کالج میں پروفیسر مقرر کیا۔ شبلی کو پروفیسر آرنلڈ سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ آرنلڈ نے شبلی سے عربی و فارسی پڑھی اور آرنلڈ نے شبلی کو انگریزی اور فرانسیسی پڑھائی۔ آرنلڈ کی کتاب ”پرپچنگ آف اسلام“ شبلی کے ہی پیدا کئے ہوئے ذوق کے سبب کچھ دنوں بعد وجود میں آئی۔

شبلی نے حالی کی ہی کی طرح سوانح نگاری، تنقید نگاری اور مضمون نگاری میں اپنی بیش بہا تصانیف چھوڑیں مثلاً المامون، الغزالی، سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی سوانح تصنیفات وجود میں آئیں۔ سیرۃ النبی بھی اس سلسلے کا عظیم کارنامہ ہے جو پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا اور اسے بعد میں شبلی کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے اسی طرز پر مکمل کیا جو طرز شبلی نے اختیار کیا تھا۔ شبلی کی سوانح نگاری کا راز ان کے اس جملے سے ہوتا ہے جو انہوں نے سیرۃ النعمان کے دیباچے میں لکھا ہے:

”سوانح عمری کے ہر وکے وہ خصائل ضرور دکھانے چاہئیں جن

میں انسانی فطرت کی جھلک نظر آتی ہے۔“

نقاد کی حیثیت سے شبلی کی شعرالجم اور موازنہ انیس و دبیر اہم ترین کتابیں ہیں، شعرالجم، فارسی شعراء کے تنقیدی مطالعہ کی وہ دستاویز ہے جس سے شبلی کے غیر معمولی مطالعہ، علمی اور تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ شعرالجم کی چوتھی جلد میں وہ اصول تنقید وضع کئے گئے ہیں جن کو باقی جلدوں میں عملی طور پر برتا گیا ہے۔ موازنہ انیس و دبیر پورے طور پر عملی تنقید کا نمونہ ہے۔ شبلی کی تنقید میں سرسید کی مقصدیت اور افادیت نہیں ملتی مگر یہ بھی سرسید کا ہی اثر ہے کہ ان کے یہاں اختلاف رائے اور ذہنی آزادی کو ہمیشہ اولیت حاصل رہی۔ اس طرح شبلی کی نثر میں سادگی کے ساتھ دلچسپی کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد

سرسید سے ڈپٹی نذیر احمد کی عقیدت کا اندازہ اس جملے سے ہوتا ہے جو انہوں نے سرسید کے لیے لکھا ہے کہ ”اگر مجھے پیر کی تلاش ہوتی تو میں ضرور ان کے ہاتھ پر بیعت کرتا۔“

سرسید سے مولوی نذیر احمد کی ملاقات ملازمت کے دوران ہوئی۔ وہ سرسید کی شخصیت اور ان کے کارنامے سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ غیر شعوری طور پر ان کی تحریریں سرسید کی علی گڑھ تحریک کا حصہ بن گئیں۔ نذیر احمد نے قرآن کا آسان اور بامحاورہ ترجمہ کر کے قرآن کی تفہیم کی راہیں آسان کیں۔ اور بامحاورہ نشر کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اس کے علاوہ نذیر احمد کے ناول ”ابن الوقت“، ”توبۃ النصوح“، ”بنات الغش“ اور ”مرآۃ العروس“ بھی اصلاح اور اخلاقی تربیت کا وہی فریضہ انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ جس کا بیڑا سرسید نے اٹھایا تھا۔ ناول نگاری کی صنف میں ڈپٹی نذیر احمد علی گڑھ تحریک کے لیے ہی اہم نہیں بلکہ اردو فکشن

میں ناول نگاری کے بانی تصور کئے جاتے ہیں۔

محسن الملک مہدی علی اور وقار الملک، مشتاق حسین سرسید کے رسالہ تہذیب الاخلاق کے ذریعے اردو دنیا میں متعارف ہوئے۔ محسن الملک نے اپنی تقریروں کے ذریعے سرسید کے مشن کو پورا کیا۔ وقار الملک قوم کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے اور جس طرح سے ان سے ہوا انہوں نے سرسید کے ساتھ تعاون کیا۔ وقار الملک تہذیب الاخلاق کے مہتمم بھی رہے۔ مولوی ذکاء اللہ علی گڑھ تحریک کے ایک اہم رکن تھے۔ تہذیب الاخلاق کے چند نمایاں مقالہ نگاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی تصانیف ان گنت ہیں۔ انہوں نے تراجم بھی کئے اور ہندوستان کی تاریخ دس جلدوں میں لکھی۔ آپ صحافت نگار بھی تھے۔

مولوی چراغ علی بھی علی گڑھ تحریک کے ایک اہم رکن تھے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے ادیب اور انشاء پرداز بھی علی گڑھ تحریک کا تسلسل کہے جاسکتے ہیں۔ یہ ادب لطیف سے وابستہ رہے۔ مگر ان کی ذہنی نشوونما میں علی گڑھ کا بڑا حصہ رہا۔ ایسے ادیبوں میں سجاد حیدر یلدرم، عبدالرحمن بجنوری، مہدی افادی، سجاد انصاری اور قاضی عبدالغفار کے نام سرفہرست آتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک

۱۹۱۷ء میں روس میں ایک زبردست انقلاب رونما ہوا۔ روس کے محنت کش لیبن کی سربراہی میں بادشاہ روس زار کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ مزدوروں اور کسانوں کی اس شاندار فتح کی گونج ساری دنیا میں سنائی دی۔ ساری دنیا میں یہ احساس عام ہوا کہ شاعر و ادیب جو اپنے سینے میں درد مند دل رکھتا ہے۔ ظالم و مظلوم کی جنگ میں غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ ۱۹۳۵ء میں دنیا بھر کے ادیب پیرس میں جمع ہوئے۔ اس کانفرنس میں ہمارے ملک کی طرف سے ملک راج آنند اور سجاد ظہیر نے شرکت کی۔ یہ دونوں ادیب اس وقت لندن میں قیام پذیر تھے۔ اور کئی دیگر نوجوانوں کی مدد سے ”انجمن ترقی پسند مصنفین“ کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ اس تحریک سے متاثر ہو کر سجاد ظہیر نے یہ طے کیا کہ اس تحریک سے ہندوستان میں بھی سب کو آشنا کرنا چاہیے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء اپریل ۱۹۳۶ء کو منشی پریم چند کی صدارت کے تحت لکھنؤ میں ”انجمن ترقی پسند مصنفین“ کی داغ بیل پڑی۔ اس طرح ترقی پسند ادیبوں نے اپنی تحریک کا جو پہلا مینی فسٹو تیار کیا وہ مندرجہ ذیل ہے۔

”ہندوستانی سماج میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ پرانے خیالات و معتقدات کی جڑیں ٹٹی جا رہی ہیں اور نیا سماج جنم لے رہا ہے۔ ہندوستانی ادیبوں کا

فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں ہونے والے تغیرات کو الفاظ اور ہیئت کا لباس دیں اور ملک کی تعمیر و ترقی کے راستے پر لگانے میں مدد و معاون ہوں۔ ہندوستانی ادب قدیم تہذیب کی تباہی کے بعد زندگی کی حقیقتوں سے بھاگ کر رہبانیت اور بھگتی کی پناہ میں جا چھپا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے روح اور بے اثر ہو گیا ہے۔ عقل و فکر کو یکسر نظر انداز بلکہ رد کر دیا گیا ہے۔

اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ادب اور دوسرے فنون کو پجاریوں اور پنڈتوں اور دوسرے قدامت پرستوں کے اجارے سے نکال کر انہیں عوام سے قریب تر لایا جائے انہیں زندگی اور واقعیت کا آئینہ دار بنایا جائے جس سے ہم اپنا مستقبل روشن کر سکیں۔ ہم ہندوستان کی تہذیبی روایات کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے ملک کے انحطاطی پہلوؤں پر بڑی بے رحمی سے تبصرہ کریں گے اور تنقیدی و تخلیقی انداز سے ان سب ہی باتوں کی مصوری کریں گے جن سے ہم اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے نئے ادب کو ہماری موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہیے اور وہ ہے ہماری روٹی کا، بد حالی کا، ہماری سماجی پستی کا اور سیاسی غلامی کا سوال۔ ہم اُسی وقت ان مسائل کو سمجھ سکیں گے اور ہم میں انقلابی روح بیدار ہوگی۔

جذبی (ولادت ۱۹۱۲ء)

معین احسن نام، جذبی تخلص۔ ۱۹۱۲ء میں اعظم گڑھ کے قصبہ مبارکپور میں پیدا ہوئے۔ ایم اے اردو پاس کرنے کے بعد ملازمت کی فکر دامن گیر ہوئی۔ کچھ عرصہ اردو ماہنامہ ”آج کل“ سے متعلق رہے۔ آخر کار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لیکچرر منتخب ہوئے۔ ترقی کر کے ریڈر ہوئے۔ جذبی کا

شعری اسلوب مختصر لیکن چمکی بہا انتخاب ہے۔ بہا شعری مجموعہ

”فروزاں“ دوسرا ”سخن مختصر“ ہے۔ جذبی ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر رہے۔ محنت کشوں اور غریبوں کی حمایت میں نظمیں کہیں۔ لیکن ان میں نعرہ بازی اور کمیونزم کے پرچار کا انداز کہیں نہیں پیدا ہونے دیا۔ فن کی کسوٹی پر ان کا ہر شعر پورا اترتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ملے مجھ کو غم سے فرصت تو سناؤں وہ فسانہ

کہ ٹپک پڑے نظر سے مے عشرتِ شبانہ

یہی زندگی مصیبت، یہی زندگی مسرت

یہی زندگی حقیقت، یہی زندگی فسانہ

فیض (۱۹۱۱ء-۱۹۸۴ء)

فیض احمد نام، فیض تخلص ۱۹۱۱ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ اشتراکی ذہن رکھتے تھے اور کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔ فیض جب کالج میں زیر تعلیم تھے اسی وقت سے شعر کہنے لگے تھے۔ کالج میگزین ”راوی“ میں متعدد نظمیں شائع ہوئیں جن میں سے بعض ان کے پہلے مجموعہ کلام ”نقش و نریادی“ میں شامل ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری سے فیض کی طبیعت کو بے حد مناسبت تھی۔ چونکہ ترقی پسند تحریک خطابہ شاعری کا مطالبہ کرتی تھی۔ حالات کے تقاضے سے مجبور ہو کر فیض کو ایسی شاعری بھی کرنی پڑی جس میں براہ راست مخاطب تھا۔ انہوں نے رمز و ایما کا سہارا لے کر اپنے مخصوص انداز کی شاعری کی۔ ”ہم لوگ“، ”صبح آزادی“، ”تہائی“ اور ”دریچہ“ ایسی لافانی نظمیں ہیں جس میں شاعر نے ادبی ڈکٹیٹروں کی پروا کئے بغیر اپنے انداز کی شاعری کی ہے اور لازوال تخلیقات پیش کی ہیں۔ غزل کا بھی یہی حال ہے۔ آپ کا انتقال ۱۹۸۴ء میں ہوا۔

فیض کے چند اشعار

چمن میں غیرت گل چسین سے جانے کیا گزری
 قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے
 درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
 تو فیضِ دل میں ستارے ابھرنے لگتے ہیں
 سردارِ جعفری

آپ کی ولادت ۱۹۱۳ء میں بلرام پور ضلع گونڈھ میں ہوئی۔ ترقی پسند تحریک ادیبوں اور شاعروں سے صناعی، پیچیدگی اور ابہام کے بجائے واضح و آشکار لفظوں میں مظلوم محنت کشوں کی حمایت اور ظالم سرمایہ داروں کے خلاف کھلی جنگ کا مطالبہ کرتی تھی۔ اردو کے بلند پایہ مقررین میں جعفری کا شمار ہے۔ نوعمری ہی سے ترقی پسند تحریک کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کے کلام کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں مثلاً ”پرواز“، ”خون کی لکیر“، ”نئی دنیا کو سلام“ اور ”ایشیا جاگ اٹھا“ وغیرہ۔ وہ سب کچھ جو ہم میں انتشار، نفاق اور اندھی تقلید کی طرف لے جاتا ہے۔ قدامت پسند ہے۔ وہ سب کچھ جو ہم میں تنقیدی صلاحیت پیدا کرتا ہے جو ہمیں اپنی عزیز روایات کو بھی عقل و ادراک کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے اُکستاتا ہے۔ جو ہمیں صحت مند بناتا ہے اور جو ہم میں اتحاد اور یک جہتی کی قوت پیدا کرتا ہے اس کو ہم ترقی پسند کہتے ہیں۔

مختصر اُس مینی فسٹو میں تین باتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ یعنی (۱) ادب کے ذریعہ ہم سماج کی خدمت کریں گے (۲) طبقاتی کشمکش کو ختم کریں گے اور (۳) ہماری ساری ہمدردی غریب طبقے کے ساتھ ہوگی۔ اور غلامی سے آزادی حاصل کریں گے۔

ترقی پسند تحریک بہت جلد ہندوستان میں مقبول ہو گئی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو

نے تحریک کی تائید کی۔ پریم چند نے ایک اجلاس کی صدارت فرمائی۔ محسنون گورکھپوری، مجاز، فیض، سردار جعفری، معین احسن جذبی، منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی جیسے نامور شاعروں اور ادیبوں نے اس تحریک میں شامل ہونے کا اعلان کیا اور ترقی پسند ادب سے یہ فائدہ ہوا کہ حقیقت نگاری سامنے آئی۔ ادب کی افادیت پر زور دیا گیا۔ موضوعات کا دائرہ وسیع ہوا۔ ادب عوام کی امنگوں کا ترجمان بنا اور اشتراکیت (کمیونزم) کو حمایت ملی۔

اس تحریک کے جو نتائج برآمد ہوئے وہ عوام کی بھلائی اور بہتری کے لیے مدد و ثابت ہوئے۔ مسرت حاصل کرنے اور وقت گزارنے کا ذریعہ نہ رہا بلکہ زندگی کو سنوارنے اور بہتر بنانے کا وسیلہ بن گیا۔ آئیے اب دیکھیں کہ ہمارے کن شاعروں اور ادیبوں نے اپنی شاعری اور ادب سے ترقی پسند کے فروغ میں مدد کی۔

مجاز (۱۹۰۹ء-۱۹۵۵ء)

اسرار الحق نام مجاز تخلص۔ ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکمل کر کے علی گڑھ مزید تعلیم حاصل کرنے آئے۔ چونکہ علی گڑھ میں تحریک کا چرچا تھا اس لیے مجاز بھی تحریک سے متاثر ہوئے اور اس کے ہم نوا ہو گئے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ”آہنگ“ کے نام سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ کچھ نظمیں مثلاً ”رات اور ریل“، ”آوارہ“، ”اندھی رات کا مسافر“ بہت مقبول ہوئیں۔ کچھ افسانوں کے ساتھ یہ مجموعہ ۱۹۴۵ء ”شب تاب“ کے نام سے شائع ہوا۔ ایک اور مجموعہ ”سازِ نو“ کے نام سے چھپا۔ آپ نے رومانی نظمیں زیادہ لکھیں جن میں فنی بصیرت اور فطرت انسانی موجود ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ یہ ہیں

کچھ تو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورشِ دوران بھول گئے
وہ زلفِ پریشان بھول گئے، وہ دیدہ گریاں بھول گئے
سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کرنے کے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے
کثرتِ مے نوشی موت کا سبب بنی۔ ۱۹۵۵ء میں انتقال ہوا۔

محبس روح (۱۹۰۹ء)

اسرار الحسن نام، مجروحِ تخلص، پیدائش اعظم گڑھ میں ۱۹۰۹ء میں ہوئی۔
اردو، فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد فیض آباد اور الہ آباد گئے۔
وہاں سے عربی کے امتحانات مولوی اور مولوی عالم پاس کئے۔ ۱۹۳۵ء میں فلمی شہر
بمبئی کو اپنا وطن بنا کر فلموں کے لیے گانے لکھنے لگے جو بہت مقبول ہوئے۔ مجروح
غزل کے شاعر ہیں اور ترقی پسند تحریک نے غزل کے بجائے نظم کو اہمیت دی اس
لیے غزل کو ایک نیا انداز دیا۔ آپ زیادہ گوئی کے قائل نہیں۔ کم کہتے ہیں مگر بہت
خوب کہتے ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام ”غزل“ سے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

سادے اور بھی گذرے تری اُلفت کے سوا
ہاں مجھے دیکھ مجھے اب میری تصویر نہ دیکھ
کچھ بھی ہوں پھر بھی دکھے دل کی صدا ہوں ناداں
میری باتوں کو سمجھ تلخیِ تقریر نہ دیکھ

مخدوم (۱۹۰۸ء-۱۹۶۹ء)

محی الدین نام، مخدوم تخلص، ۱۹۰۸ء میں حیدر آباد دکن کے ایک گاؤں میں
پیدا ہوئے۔ تعلیم حیدر آباد ہی میں ہوئی۔ ۱۹۳۶ء میں جب ملک کے مختلف

مقامات پر ”انجمن ترقی پسند مصنفین“ کی شاخیں قائم ہوئیں تو مخدوم نے حیدر آباد

میں اس کی شاخ قائم کی۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور حیدر آباد میں تحریک کے حامیوں کا ایک حلقہ پیدا ہو گیا۔ ان کے کلام کا پہلا مجموعہ ۱۹۴۴ء میں ”سرخ سویرا“ کے نام سے اور دوسرا مجموعہ ۱۹۶۱ء میں ”گل تر کے نام سے شائع ہوا۔ آپ محنت کشوں کے شاعر ہیں۔ اور آپ کی بیشتر نظمیں سیاسی ہیں۔

وامق جو نیوری

احمد مجتبیٰ نام، وامق تخلص ۱۹۱۳ء میں کج گاؤں ضلع جو نیور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی آخری منزل تک پہنچتے پہنچتے شاعری بھی شروع کی۔ ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہوئے ”چینیں“ اور ”جرس“ وامق کا کلام مظلوموں اور محنت کشوں کے کرب کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ وامق کی نظمیں ”بھوکا بنگال“، ”مینا بازار“، ”تقسیم پنجاب“ بہت مقبول ہوئیں۔ چند شعر ملاحظہ ہو۔

سرخ دامن میں شفق کے کوئی تارا نہیں
ہم کو مستقبل زرین نے پکارا تو نہیں
دست و پاشل ہیں کنارے سے لگا بیٹھا ہوں
لیکن اس شورش طوفان سے ہار تو نہیں
آکے پھر لوٹ چلی کشتی دل ساحل سے
پھر کسی موج طوفان نے پکارا تو نہیں

وجد

سکندر علی نام، وجد تخلص ۱۹۱۴ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ پھر سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہو کر سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے اور ترقی کر کے ڈسٹرکٹ سیشن جج کے منصب تک پہنچے۔ لہو ترنگ، آفتاب تازہ، اور اوراق

مصور اور بیاض مریم ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں
 اے موسم خوش گوار آہستہ گزر
 اے عکس جمال یار آہستہ گزر
 زندوں میں نہ ہو بجائے قیامت برپا
 اے فتنہ بہار آہستہ گزر

تاباں

غلام ربانی تاباں نام، تاباں تخلص، ۱۹۱۴ء میں قائم گنج میں پیدا ہوئے۔ وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اشتراکیت سے متاثر تھے اس لیے سیاسی تحریک میں حصہ لینے لگے۔ مکتبہ جامعہ دہلی میں جنرل منیجر ہو گئے۔ وہیں سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۹۳ء میں وفات پائی۔ ان کے کلام کے مجموعے ”ساز لرزاں“ اور ”حدیث دل“ اس کے علاوہ نظموں کے دو مجموعے اور ہیں۔ ”شکستِ زنداں“ اور ”غم دوراں“۔ ان میں سیاسی نظمیں شامل ہیں۔ غزل اور نظم دونوں پر تاباں حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ غزل میں کلاسیکی رچاؤ موجود ہے۔ ان کی بیشتر نظمیں ہنگامی موضوعات سے متعلق ہیں۔ نیز یہ کہ مارکسی نظریے سے وہ کسی حال میں دست بردار نہیں ہوتے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

یہ میں نے کیا کیا ہدم کہ رات ختم ہوئی
 مگر افق پہ چمکتا ہے صبح کا تارا
 وہ ایک ٹھوس حقیقت ہے آج مشرق میں
 جو انقلاب کہ کل تک فقط ہٹا اک نعرہ
 جو کرتے آئے غلاموں کے خون سے گلکاری
 لہو سے ان کے ہے رنگین ایشیا سارا

ساحر لدھیانوی

عبداللہ نام، ساحر تخلص۔ ۱۹۲۱ء میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد ساحر کو بہت تکلیف دہ حالات سے گزرنا پڑا۔ روزگار کی تلاش میں بمبئی پہنچے اور فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔ ان کے فلمی گانے بہت مقبول ہوئے۔ بمبئی میں ساحر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں پابندی کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ ’تلخیاں‘ ان کے ابتدائی زمانے کا کلام ہے۔ طویل نظم ”پرچھائیاں“ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ان کے کلام کا ایک مجموعہ ”آؤ کہ کوئی خواب بُنیں“ کے نام سے شائع ہوا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہوز ہریہ بھی پی لیا میں نے
انہیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدت حسین خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

ترقی پسند تحریک کے اثر سے اردو افسانے میں طبقاتی کشمکش کو خاص طور سے موضوع بنایا گیا لہذا مل مالک اور مزدور، زمیندار اور محنت کش کے کردار سامنے آئے اور اس ضمن میں ترقی پسند تحریک کا اثر یوں نمایاں ہوا۔ کہ مسل مالکوں اور زمینداروں کو ظالم اور مزدوروں و محنت کشوں کو مظلوم دکھایا گیا۔ عصری مسائل کو بھی موضوع بنایا گیا۔ اس سلسلہ میں قحط بنگال، دوسری عالم گیر جنگ، تقسیم ملک اور فسادات کو موضوع بنایا گیا۔ نیز اقتصادی مسائل کو بھی خاص طور پر موضوع بنایا گیا۔ بے روزگار نو جوانوں اور ملازمت پیشہ عورتوں پر بھی بے تکان لکھا گیا۔ اسی طرح معاشرتی مسائل کو بھی موضوع بنایا۔ اس ضمن میں خاندان کے افراد اور جنسی مسائل پر تفصیل سے لکھا گیا۔ عقائد کی تبدیلیوں کا تجربہ کیا گیا۔ اسی طرح ترقی پسند

تحریک کا اثر افسانے کی زبان و بیان پر بھی کافی پڑا۔ حقیقت نگاری اور واقعیت نگاری نے افسانہ نگار کو مجبور کیا کہ وہ صرف ادبی زبان کا پابند نہ رہے بلکہ کردار کی مناسبت سے اس کی مخصوص زبان کا ذکر کرے۔ ترقی پسند تحریک کا اثر اردو افسانے پر ناقابل انکار ہے۔

اب انفرادی طور پر چند مشہور افسانہ نگاروں کو لیجئے جو ترقی پسند تحریک کے زیر اثر پروان چڑھے۔ ۱۹۳۶ء کے بعد اردو افسانہ نگاروں کی جوئی پود پروان چڑھی اس میں کرشن چندر کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ پریم چند کے بعد کسی اور افسانہ نگار کے حصے میں نہیں آئی۔ وہ شروع سے آخر تک غیر معمولی طور پر اس تحریک سے منسلک رہے۔ ”ان داتا“، ”بھگت رام“، ”کالو بھنگی“ اور ”برہم پترا“ ان کے بہترین افسانے ہیں۔

ترقی پسند دور کے دوسرے افسانہ نگار سعادت حسن منٹو ہیں۔ کرشن چندر کے بعد انہوں نے سب سے زیادہ افسانے لکھے۔ ان کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے۔ ”ٹوبہ ٹیک سنگھ“، ”ہتک“، ”باپو گوپا ناتھ“، ”ٹھنڈا گوشت“ ان کے زندہ جاوید افسانے ہیں۔ منٹو ایک نڈر شخصیت کے مالک تھے اور جو کچھ محسوس کرتے اسے بے باکی سے نوک قلم تک لاتے۔

راجندر سنگھ بیدی افسانے کی دنیا میں اس دھماکے سے نہیں آئے جیسے کرشن چندر، منٹو اور عصمت آئے۔ ان کا ارتقاء آہستہ رو ہے۔ ترقی پسندان کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہمیشہ امید کا پیغام دیا ہے۔ بیدی کے پہلے مجموعہ ”دانہ و دام“ کے افسانے ترقی پسند ادب میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں اکثر کا تعلق دیہاتی زندگی سے ہے۔ ”گرم کوٹ“، ”گرہن“، ”اپنے دکھ مجھے دیدو“،

”لاجوتی“ ان کے بہترین افسانے ہیں۔

عصمت چغتائی افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ مشہور ہیں بالخصوص ترقی پسند تحریک سے وابستہ خواتین، افسانہ نگاروں میں۔ عصمت کا ذہن حقیقت نگاری کا دلدادہ ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے ”کلیاں“، ”چوٹیں“، ”دھانی بانکیں“ اور ”چھوٹی موٹی“ وغیرہ ہیں۔

اخیر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حقیقت ہے ۱۹۳۶ء میں ایک کانفرنس کے بعد اس تحریک نے باضابطہ صورت اختیار کی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی بھی تحریک کا خیر مقدم اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک اس کے لیے ایک ذہنی فضا تیار نہ ہو چکی ہو۔ چنانچہ پریم چند نے ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے خطبہ صدارت میں ادب کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا۔

”ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔ سلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔“

اس طرح اور آنے والے افسانہ نگاروں میں بیشتر کافن پریم چند کے ان ہی خیالات کی تفسیر نظر آتا ہے۔ ان میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عزیز احمد، حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، ممتاز مفتی، خواجہ احمد عباس، اوپندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور وغیرہ کے موضوعات کا متنوع، تکنیک کے تجربات، اسلوب میں جدت اور دافسانے کا سرمایہ ہیں۔ افسانہ نگاروں کی یہ فہرست گونا گونا گونہ ہے لیکن اس سے ان ترقی پسندوں کے ترقی پسند افسانے کے موضوعات میں تنوع اور ہمہ گیری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اُردو شاعری کے دبستان

اُردو شاعری ملک کے مختلف مراکز میں پھلی پھولی۔ ان میں دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد اور رامپور اہم مقامات ہیں۔

دبستانِ دہلی

دہلی شعر و شاعری کا مرکز تو پہلے ہی تھی۔ لیکن ۱۷۰۰ء میں ولی کے دہلی آنے اور ۱۷۱۹ء میں ان کا دیوان دہلی پہنچنے کے بعد دلی کے شعراء کو جو فاسی میں شعر کہتے تھے احساس ہوا کہ عام بول چال کی زبان جسے گری پڑی زبان سمجھا جاتا ہے اور جسے ریختہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس میں بھی ایسے شعر کہے جاسکتے ہیں جس سے عوام اور خواص دونوں لطف اندوز ہو سکیں۔ چنانچہ اس زبان میں جو آگے چل کر اُردو کہلائی شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ خان آرزو، آبرو، حاتم، شاکر، ناجی، مضمون، بیان، اُمید اور مخلص اس دور کے خاص شعراء ہیں۔

اس دور میں ایہام گوئی کا بہت رواج ہو گیا تھا اور یہ شاعری کی ترقی کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ ایہام گوئی ایک صنعت ہے۔ اس میں شاعر ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جس کے اصل معنی تک قاری کا ذہن مشکل سے پہنچتا ہے۔ گویا یہ ایک طرح کا گورکھ دھندا ہوتا ہے جیسے ۔

اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں

یہاں عارضی کے دو معنی ہیں ناپائیدار اور رخسار۔

اس مثال سے اندازہ ہوگا کہ یہ ایک مشکل صنعت ہے اور اس کا استعمال ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ آخر اس کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا۔ خود حاتم نے اپنے دیوان سے وہ اشعار خارج کر دئے جن میں یہ صنعت موجود تھی۔ ایہام سے نجات پاتے ہی اردو شاعری تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرنے لگی۔ اردو شاعری کو ایہام سے پاک کرنے میں میر، مرزا، مظہر اور یقین نے اہم خدمات انجام دیں۔

اس کے بعد میر و مرزا کا دور شروع ہوتا ہے جسے اردو شاعری کی زبردست ترقی کا دور کہنا بجا ہے۔ میر کی ساری زندگی آلام و مصائب میں گزری۔ اس کا عکس ان کے شعروں میں نظر آتا ہے۔ اس لیے ان کے کلام کو ان کی آپ بیتی کہنا روا ہے۔ میر کے کلام نے ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنالیا اور ان کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی۔ یہی زمانہ سودا کا تھا جو کچھ میر کی آنکھوں نے دیکھا وہی سودا نے بھی دیکھا۔ لیکن دونوں کی طبیعتیں مختلف تھیں وہ بے فکرے تھے اور مصیبت کو ہنسی میں اڑا دینے والے انسان تھے۔ انہوں نے شہر آشوب لکھ کر دہلی کی بربادی کا مذاق اڑایا۔ سودا کی غزلیں بھی خوب ہیں۔ مگر وہ قصیدے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اس دور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ ہر صنف شاعری کو فروغ ہوا۔

دہلی کی بربادی پر اس دور کا خاتمہ ہوا۔ اس شہر میں رہنا دشوار ہو گیا۔ تو اہل کمال اسے خیر باد کہہ کے ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ خواجہ میر درد صوفی تھے۔ وہ صبر و شکر کے ساتھ جس گوشے میں بیٹھے تھے وہیں بیٹھے رہے۔ یہ اہل کمال آخر لکھنؤ میں جمع ہوئے۔ کونکہ وہاں آسائش و آسودگی میر تھے۔ کچھ عرصہ بعد دہلی کی محفلیں

پھر سے آراستہ ہو گئیں اور اردو شاعری عروج پر پہنچی۔ ان شعراء میں ایک طرف شاہ نصیر، ذوق اور ظفر نظر آتے ہیں جن کی زیادہ توجہ زبان و بیان پر ہے۔ دوسری طرف مومن ہیں کہ دربار کی دنیا سے الگ اپنے گھر میں گوشہ نشین ہیں۔ اور غزل میں خالص عشق و عاشقی کی شاعری کر رہے ہیں۔ غالب جن کے نزدیک شاعری قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی ہے۔ ان کی شاعری میں فکر کا عنصر داخل ہے غزل کے موضوعات کو وسعت دیتے ہیں۔ تخیل کی بلندی اور فاری الفاظ و تراکیب کا استعمال ان کے کلام کو پیچیدہ بنا دیتا ہے۔

اس کے بعد داغ کا زمانہ آتا ہے ان کے نزدیک زبان کا چٹخارہ ہی شعر کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ یہ وہ رنگ ہے جسے ان کے تلامذہ سائل اور پنجو نے بھی جاری رکھا۔ اس کے بعد دہلی کی مرکزیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

دبستان دہلی کی خصوصیات

دہلی صوفیا کا مرکز رہی ہے۔ اس لیے دہلی کے شعراء تصوف کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ فلسفہ وحدت الوجود کی ان پر گہری چھاپ تھی۔ اس لیے دہلی کے دبستان شاعری کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس پر تصوف کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ میر تقی میر اور خواجہ میر درد تصوف کے اہم شاعر ہیں۔ غالب کی شاعری میں تصوف کے جلوے نظر آتے ہیں۔ میر کا کلام ہے ۔

ناحق ہم محسبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی

چاہتے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا

انگریزوں کی مداخلت سے اودھ کی آزادی تو چھن گئی لیکن ان کے صلح کے

نتیجے میں اودھ کو ایک بڑا امن اور خوشحال زندگی نصیب ہو گئی۔ عیش و عشرت کی زندگی

اس خوشحالی کا لازمی نتیجہ تھی۔ ہر طرف راگ و رنگ کی بزم آراستہ ہو گئی اور شعر و سخن کی محفل سج گئی۔ ادھر دہلی میں اہل کمال کی گزر مشکل ہو گئی۔ تو وہ ایک ایک کر کے لکھنؤ میں جمع ہو گئے۔ ان میں بڑی تعداد شاعروں کی تھی۔

میر ضاحک، سوز، سودا وغیرہ تو پہلے ہی اودھ پہنچ کے مشاعروں میں مقبول ہو چکے تھے۔ میر حسن، جرأت، انشاء اور مصحفی ان کے بعد یہاں پہنچے اور یہیں سے دبستان لکھنؤ کی بنیاد پڑی۔ جرأت کا مزاج ہمیشہ سے معاملہ بندی کی طرف مائل تھا۔ لکھنؤ کے رنگین ماحول میں شاعری کا یہ انداز بہت مقبول ہوا اور دوسرے شاعر بھی اسی رنگ میں رنگتے چلے گئے۔ لکھنؤ کے غیر سنجیدہ ماحول سے اخلاقی قدروں کا ایسا زوال ہو گیا تھا کہ انشاء و مصحفی کی شاعرانہ چشمک نے ہزل، دشنام اور پھر سوانگ کی شکل اختیار کر لی۔

لکھنؤ کا ماحول ریختی گوئی کو بھی بہت راس آ یا۔ ریختی شاعری کی وہ صنف ہے جس میں عورتوں کے جذبات انہیں کی زبان میں پیش کئے جاتے ہیں۔ رنگین و انشا کے قلم نے اسی میدان میں خوب گل کاریاں کیں۔

اس سے اگلی نسل کے شاعروں میں ناسخ کا نام قابل ذکر ہے۔ اصلاح زبان ان کا اصل کارنامہ ہے۔ ہمارے تنقید نگاروں نے ان کو ادبی ڈکٹیٹر کہا ہے کیونکہ جس لفظ یا جس محاورے کو انہوں نے رد کر دیا وہ مکالمات باہر ہو گیا۔ لکھنؤ کی انفرادیت انہیں کے دم سے قائم ہوئی۔ آتش صوفی تھے اور بہت خوش گو شاعر۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ شاعری مرصع سازی ہے۔ اور شعر کہنا موتی پروانے کے برابر ہے۔ ناسخ کے شاگردوں میں وزیر، برقی، رشک، بحر میر اور آتش کے شاگردوں میں رند، صبا، نسیم اور شوق وغیرہ نے بہت شہرت پائی۔ پنڈت دیاندر نسیم آتش کے شاگرد تھے۔ انہوں نے مشنری گلزار نسیم کے تحت دوام کے دربار

میں جگہ پائی۔ ضمیر و خلیق اور ان کے بعد انیس و دبیر کے ہاتھوں مرثیے کی صنف نے بے مثال فروغ پایا۔

خواجہ میر درد کا ارشاد ہے ۔

پڑی جس طرف کو نگاہ یاں
نظر آگیا ہے خدا ہی واں
یہ ہیں گو کہ آنکھوں کی پتلیاں
میرے دل میں بجائے بتاں نہیں
غالب کا ایک شعر ہے ۔

نہ ہتا کچھ تو خدا ہتا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

شعراے دہلی کے کلام میں عشق و عاشقی کا ذکر خوب ملتا ہے۔ لیکن پاکیزگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ یہاں وصال سے زیادہ ہجر کی طلب نظر آتی ہے۔ محبوب کے ادب و احترام کا یہ حال ہے ۔

دور بیٹھا غبار میر اس سے

عشق بن یہ ادب نہیں آتا

یہاں حسن و عاشقی کے خارجی معاملات کا نہیں داخلی واردات کا بیان ملتا ہے۔ شوخی اور زبان کی رنگینی یہاں کم ہے۔ خیالات سادہ ہیں۔ تو ان کے اظہار کا اندازہ بھی سادہ ہے۔ تصنع اور بناوٹ سے گریز اس دبستان کی اہم خصوصیت ہے۔ تشبیہات و استعارات میں دلکشی ہے مگر سادگی کا دامن یہاں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔

دبستان لکھنؤ

سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد کھوکھلی ہونے لگی اور سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ تو صوبے رفتہ رفتہ خود مختار ہوتے چلے گئے۔ ان میں ایک صوبہ اودھ بھی تھا۔ ۱۷۲۲ء میں جب سعادت خان شاہ دہلی کی طرف سے صوبیدار مقرر ہوئے۔ تو مغل سلطنت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔

سعادت علی خان کے انتظام سے اودھ میں خوشحالی آئی مگر ان کی توجہ زیادہ تر دہلی کے معاملات پر رہی۔ شجاع الدولہ کے دل میں بڑے ولولے تھے لیکن بکسر کی شکست سے ان کے خواب چکنا چور ہو گئے۔ ان کے بعد آصف الدولہ نے فیض آباد کی جگہ لکھنؤ کو دار السلطنت بنایا اور دونوں ہاتھوں سے خزانہ لٹا کر لکھنؤ مشہور ہوئے۔

دبستان لکھنؤ کی خصوصیات

دبستان لکھنؤ کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کی شاعری میں نشاطِ عنصر غالب نظر آتا ہے۔ یعنی لکھنؤ کے شعری سرمائے میں مسرت کی لہر دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ لکھنؤ کی پُر امن اور خوشحالی کا عطیہ ہے۔

فارغ البالی نے اہل لکھنؤ کو عیش و عشرت کی طرف مائل کر دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں عیش کے دیگر لوازم کے علاوہ طوائفوں کی بھی کثرت تھی۔ گویا یہاں حسن بے نقاب تھا۔ چنانچہ لکھنؤ کی شاعری میں عورت کے حسن کا بھرپور بیان ملتا ہے۔ اس کے زیور اور لباس کا ذکر بجا نظر آتا ہے۔ اس سے شاعری میں سطحیت تو ضرور

پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن اردو شاعری جواب تک نسوانی حسن کے ذکر سے محروم تھی۔

اس میں صنف نازک کے بدن کے خدو خال نمایاں ہو جاتے ہیں۔

لکھنوی شاعری میں تصوف کے مضامین نہ ہونے کے برابر ہیں۔ دہلی صوفیوں کا مرکز تھی لیکن لکھنؤ کا معاملہ مختلف تھا۔ یہاں کے رنگین ماحول میں نہ صوفیوں کا گزر تھا نہ صبر و قناعت کی تعلیم کی ضرورت۔

دبستان لکھنؤ کی شاعری زبان کے نقطہ نظر سے زیادہ دلکش اور پُرکشش ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اہل لکھنؤ ہر معاملے میں دہلی والوں سے الگ اور ممتاز نظر آنے کے خواہاں رہے۔ زبان کے سلسلے میں انہوں نے اہل دہلی سے الگ اپنا راستہ نکالا۔ شعرائے لکھنؤ نے جذبات سے زیادہ الفاظ کی نوک پلک سنوارنے اور زبان میں لطافت پیدا کرنے پر زور دیا اور اس میں شک نہیں کہ دبستان لکھنؤ کی زبان زیادہ دل آویز ہو گئی۔

اُردو ناول

ناول اطالوی لفظ (Novella) سے نکلا ہے جس کے معنی قریب قریب (News) کے ہیں۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایسے واقعات بیان کئے جائیں جو ہم عصر اور سچے ہوں۔

یہ ادب کی اہم شاخ ہے جو ہماری زندگی کی مختلف گتھیوں کے سلجھانے میں مدد دیتی ہے۔ ناول کی بنیاد بھی وہی انسان کا فطری طور پر قصہ پسندی کا رجحان ہے۔

ایک اچھے ناول کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا پلاٹ چاہے غریب طبقے سے لیا جائے یا امیر طبقے سے۔ اس کا تعلق ماضی سے ہو یا حال سے لیکن اس کے پلاٹ میں زندگی کی پرچھائیاں ضرور ہونی چاہئیں۔

اچھا ناول خواہ المیہ ہو یا طربیہ زندگی کے مسائل سے بحث کرتا ہے۔ وہ سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل سے متعلق نقطہ نظر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔

فنی اعتبار سے ناول کے اجزائے ترکیبی میں پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ، منظر نگاری اور نظریہ حیات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہر ناول نگار کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے جس کو وہ خاص طریقے سے ترتیب دیتا ہے اور قدریں پیدا کرتا ہے۔

اس لیے نقطہ نظر کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ناول انسانی زندگی کی تصویر ہے۔ اس

کے کردار بھی انسان ہوتے ہیں جس قدر ناول کے کردار حقیقی زندگی سے زیادہ قریب ہوں گے اسی قدر وہ کامیاب ناول کہلائے گا۔

ہمارے یہاں ۱۷۵۷ء سے قبل قصہ گوئی داستانوں کی شکل میں تھی لیکن غدر کے بعد حالات نے پلٹا کھایا۔ زندگی کو زیادہ حقیقت پسندانہ انداز میں دیکھا جانے لگا اور اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ادب بھی معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ ہو۔ انیسویں صدی کے ہندوستان میں جو انقلاب رونما ہو رہا تھا اس کی بہترین تصویریں اُردو ناول نے پیش کیں۔

ناول ہمارے یہاں مغرب کے اثر سے وجود میں آیا۔ انگریزی میں ”رچرڈسن“ اور ”فیلڈنگ“ کو ناول کا موجد کہتے ہیں۔ ہمارے یہاں نذیر احمد اور پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اُردو ادب میں ناول کی بنیاد ڈالی۔ نذیر احمد کی کہانیوں کو ناول کا اولین نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ انہوں نے نمودار ہوتی ہوئی زندگی کے نقوش کو اُبھارا۔ ”مراۃ العروس“ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کے چند سال بعد اعظم گڑھ کے قیام کے دوران ”توبۃ النصوح“ لکھی۔ ان کی کہانیاں تعلیمی، اخلاقی اور مذہبی نقطہ نظر سے لکھی گئی تھیں۔ ان میں پلاٹ مکمل اور واضح ہے۔ نذیر احمد روزمرہ کی با محاورہ زبان کستے ہیں۔ ناول نگاری پر ان کو قدرت حاصل ہے۔ مکالموں کے ذریعہ کرداروں کی سیرت اور جذبات اور خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

رتن ناتھ سرشار نے نذیر احمد کی روایت کو آگے بڑھایا۔ یوں تو انہوں نے متعدد ناول لکھے ”فسانہ آزاد“، ”جام سرشار“، ”کامنٹی“ لیکن ان کا سب سے کامیاب نمائندہ ناول ”فسانہ آزاد“ ہے۔ یہ پہلے اودھ پنچ اخبار میں قسط وار، پھر کتابی صورت میں شائع ہوا۔ یہ سرشار کا طبع زاد قصہ ہے۔ اس کا موضوع لکھنؤ میں جاگیردارانہ عہد کی زوال پذیر معاشرت ہے۔

اس کا طرز بیان ظریفانہ ہے۔ چست مکالمہ نگاری اور بیگماتی زبان نے اس کی دلکشی میں اضافہ کر دیا ہے۔ فسانہ آزاد کے چند کردار جیسے خوجی، آزاد وغیرہ اپنے مصنف کا نام زندہ رکھنے میں کامیاب ہیں۔ سرشار کی نثر کا طرز اردو کے ارتقاء کے لحاظ سے نذیر احمد سے زیادہ قدیم ہے۔ اردو ناول کا دوسرا اہم دور تاریخی ناولوں اور ترجموں کا دور تھا عبدالحلیم شرر اور محمد علی طیب نے اسلاف کے کارنامے لکھے۔

مرزا محمد ہادی رسوا سے اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ رسوا نے ماضی کی تاریخ اور اصلاحی جوش و خروش کو چھوڑ کر حقیقت نگاری کو شعار بنایا۔ ناولوں کو اپنے زمانے کی تصویر سے سجایا۔ روزمرہ زندگی سے پلاٹ اخذ کئے۔ ان کے ناولوں میں ”امراؤ جان ادا“، ”شریف زادہ“ وغیرہ ہیں۔ اپنے ناولوں کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

”ہمارے ناول نہ ٹریجڈی ہیں نہ کامیڈی نہ ہمارے ہیر و تلوار سے قتل

ہوتے ہیں نہ ان میں سے کسی نے خودکشی کی ہے نہ ہجر ہوا نہ وصل۔

ہمارے ناولوں کو موجودہ زمانے کی تاریخ سمجھنا چاہیے۔“

مولانا راشد الخیری کی ”صبح زندگی“، ”شام زندگی“، زبان و مکالمے کے لحاظ

سے اور مسلمان خواتین کی روزمرہ زندگی کی تصویر ہونے کے اعتبار سے ادب

میں ایک مخصوص درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے یہاں معاشرے کے المناک حالات کی

ایسی سچی تصویریں ہیں کہ انہیں ”مصورِ غم“ کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

حقیقت میں دیکھا جائے تو تمام کوششوں کو پریم چند نے بام عروج تک

پہنچایا۔ وہ جدید اردو ناول کے بانی کہے جاسکتے ہیں۔ ان کے ناولوں کو مرکز

انسان اور انسان دوستی ہے۔ انہوں نے اردو ناول کو بہت وسعت دی۔

”بازار حسن“، ”چوگان ہستی“، ”میدانِ عمل“، ”گوشہ عافیت“،

’گودان‘ وغیرہ اچھے ناول ہیں۔

پریم چند کے بعد جن ادیبوں نے اردو ناول کی روایات اور اس کے فن کو فروغ دینے کی کوشش کی وہ ترقی پسند ادیب ہیں۔ انہوں نے اردو ناولوں کو بدلتی ہوئی زندگی اور فن کے تقاضے سے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی۔ ان میں سجاد ظہیر کا ناول ’’لندن کی ایک رات‘‘، قاضی عبدالغفار کا ’’لسلی کے خطوط‘‘، عصمت کا ’’ٹیڑھی لکیر‘‘، قرۃ العین حیدر کا ’’آگ کا دریا‘‘ اور ’’میرے بھی صنم خانے‘‘، کرشن چندر کا ’’شکست‘‘ اور عزیز احمد کا ’’گریز‘‘ قابل ذکر ہیں۔

جدید ناول نگاروں نے مغرب کے جدید اثرات کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا ہے۔ ’’ٹامس ہارڈی‘‘، ’’ڈی ایچ لارنس‘‘، ’’ایلبیٹ‘‘، ’’فیکسم گورکی‘‘ کے اثرات براہ راست اردو کے جدید ناولوں پر اثر انداز ہوئے۔ مثلاً راجندر سنگھ بیدی کا ایک ’’چادر میلی سی‘‘، حیات اللہ انصاری کا ’’لہو کے پھول‘‘ بلونت سنگھ کا ’’معمولی لڑکی‘‘، قاضی عبدالستار کا ’’شب گزیدہ‘‘، مہندر ناتھ کا ’’ارمانوں کی سیج‘‘، آمنہ ابوالحسن کا ’’سیارہ سرخ‘‘، جمیلہ ہاشمی کا ’’تلاش بہاراں‘‘، جیلانی بانو کا ’’ایوان غزل‘‘ شوکت صدیقی کا ’’خدا کی بستی‘‘ وغیرہ اردو ادب میں غیر فانی نقوش ہیں۔

اردو ناول کی عمر کم و بیش ایک صدی کہی جاسکتی ہے۔ اس دوران ہماری زندگی میں اہم اور دور رس تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اردو ناول نے تیز رفتاری کے ساتھ ہونے والی تبدیلیوں کا ساتھ دیا ہے۔ ناول نگار کی انگلیاں معاشرے کی نبض پر رہی ہیں اور نبض کی دھڑکنوں کو اس نے اپنے ناولوں میں سمویا ہے۔ زندگی کے سکڑتے اور پھیلنے والے دائروں کو اپنی گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ زندگی کے ساتھ ناول کا یہ رشتہ اس کے روشن مستقبل کا ضامن کہا جاسکتا ہے اور حقیقی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہماری اُمگلیں اور آرزوئیں جھلکتی

ہیں۔ گویا ناول زندگی کی تصویر کشی کا فن ہے۔ حقیقت کو تخلیق کا روپ دے کر یا تخلیق کو حقیقت کا جامہ پہنا کر اُس طرح پیش کرنا کہ قصہ کی حیثیت سے اس کے تمام اجزاء میں تال میل اور ہم آہنگی قائم رہے۔ ناول ہے۔

کچھ اور ناول اور ناول نگار

چونکہ زمانہ حاضر کے بہت سے ناول نگار اور بھی ہیں جنہوں نے اچھے ناول لکھے ہیں۔ یہاں نہایت اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

عبداللہ حسین: ”اداس نسلیں“ ان کا بہت اہم ناول ہے۔ انسانی نفسیات کا نہایت گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ ”آگ کا دریا“ سے مشابہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کا موضوع ماضی ہے اور اس کا حال و مستقبل۔ ان کے دوسرے ناول ”باگھ“، ”قید“ اور دونوں ”ندی“ اور ”رات“ بھی قابل ذکر ہیں۔ شوکت صدیقی: ”خدا کی بستی“ ان کا ناول ہے۔ متوسط اور اس سے زیادہ نچلے طبقے کے کرداروں کو بنیاد بنا کر ہمارے معاشرے کی تلخ حقیقتوں کے چہرے سے نقاب ہٹایا گیا ہے۔

خدیجہ مستور: ”آنگن“ ان کا سیدھا سادہ مگر بے حد دلچسپ ناول ہے۔ ملک کی تقسیم اس کا موضوع ہے۔ فن کار نے بہت دلچسپ کردار پیش کئے ہیں۔

جمیلہ ہاشمی: جمیلہ ہاشمی ایک معتبر ناول نگار ہیں اور ”تلاش بہاراں“ ان کا مقبول ناول ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے دوسرے ناول ہیں ”آتشِ رفتہ“ اور ”چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو“ ”روہی“ ان کا ایک اور ناول ہے۔

حیات اللہ انصاری: ”لہو کے پھول“ حیات اللہ انصاری کا ضخیم ناول جو پانچ

جلدوں میں شائع ہوا۔ مصنف نے اپنے ادارے اور مضامین اس میں جوڑ دئے

ہیں۔ ان کا ایک ناول ”مدار“ ہے۔

خواجہ احمد عباس: خواجہ احمد عباس کا مشہور ناول ”انقلاب“ ہے۔ جس کا محور انسان دوستی کا جذبہ ہے۔ مصنف کا زبان و بیان پر مکمل عبور ہے۔

ہمارے عہد کے اور بہت سے ناول ہیں۔ جن کا اتنے اختصار کے ساتھ ذکر بھی ممکن نہیں۔ یہاں ان کے صرف نام گنائے جاتے ہیں۔

قدرت اللہ شہاب کا ”یا خدا“، حجاب امتیاز علی کا ”پاگل خانہ“، جیلانی بانو کا ”ایوانِ غزل“، آمنہ ابوالحسن کا ”واپسی“، سلیم اختر کا ”ضبط کی دیوار“، رشیدہ رضوی کا ”اسی شمع کے آخری پروانے“ ہمارے عہد کے مقبول ناول ہیں۔

اردو، ناول نگاری کے اس سرسری مطالعہ سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اگرچہ ہمارے یہاں ناول بکثرت لکھے گئے لیکن ایسے معیاری اور نامکمل ناولوں کی تعداد کم ہے جنہیں ہم ترقی یافتہ زبانوں کے مقابل رکھ سکیں۔ تاہم آزادی کے بعد اس صنف کی طرف خاص توجہ جاری ہے اور ہمارے ادیب زیادہ محنت، یکسوئی اور تخلیقی محویت کے ساتھ ناول لکھ رہے ہیں۔

افسانہ

اردو زبان میں مختصر افسانہ مغربی ادب کی دین ہے۔ اور مغرب کی زبانوں میں یہ ایک جدید صنف ادب کی حیثیت سے انیسویں صدی کے آخر کی پیداوار ہے۔ اردو میں اس صدی کے شروع میں سب سے پہلے پریم چند نے افسانے لکھنا شروع کئے۔ دراصل یہ صنف ملک کے بدلتے ہوئے حالات، نئے خیالات اور ادب کے نئے تقاضوں کی وجہ سے وجود میں آئی۔

انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں میں مختصر افسانے سے پہلے ناول، تمثیلی قصے اور طویل افسانے لکھے گئے اور جب وہاں زندگی کی کشمکش بڑھی، انسان کے لیے فرصت اور فراغت کم ہوئی تو ایک ایسی صنف ادب کی ضرورت محسوس ہوئی جو کم سے کم وقت میں پڑھنے والوں کو مسرت اور تسکین دے سکے۔ اس وقت تک رسالے اور اخبار بھی کثیر تعداد میں چھپنے لگے تھے اس لیے ان کے لیے بھی ایسی دلچسپ کہانیوں کی ضرورت تھی جنہیں عام لوگ پڑھنا پسند کریں اور جو مختصر اور مکمل ہوں تاکہ ایک ہی نشست میں انہیں پڑھا جاسکے۔ اس طرح مختصر افسانہ نگاری کا رواج ہوا۔

مختصر افسانہ کی مختلف تعریفیں لکھی گئی ہیں مثلاً یہ کہ مختصر افسانہ ایک ایسا نثری قصہ ہے۔ جس کے پڑھنے میں آدھ گھنٹے سے دو گھنٹے تک کا وقت لگے۔ یا کہ مختصر افسانہ کسی شخص کی زندگی کے سب سے اہم اور دلچسپ موقع کو ڈرامائی شکل میں پیش

کرنے کا نام ہے۔ ایک ناقد کا کہنا ہے کہ مختصر افسانہ کسی ایسے واقعہ کا بیان ہے جس میں ابتداء ہو، درمیان ہو، عروج ہو اور خاتمہ ہو۔ ناول کی طرح مختصر افسانہ بھی ایک حقیقت پسندانہ صنف ہے۔ انسانی زندگی اور اسے بہتر بنانے کے لیے سماج اور فطرت کی طاقتوں سے انسان کی کشمکش اس کا موضوع ہے۔ ناول کی طرح اس میں بھی سماجی مسائل اور افراد کی ذہنی اور جذباتی الجھنوں کی ترجمانی ہوتی ہے۔ لیکن دونوں اصناف میں زندگی کی ترجمانی کا جو فرق ہے اسی سے ان کے فن کی خصوصیات کا تعین ہوتا ہے۔

ناول زندگی کی وسعت اور ہمہ رنگی کی تصویر ہوتا ہے۔ افسانہ میں اس وسیع زندگی کے کسی ایک گوشے، کسی ایک واقعہ یا کسی ایک نفسیاتی حقیقت کو مؤثر طریقہ سے پیش کیا جاتا ہے۔ ناول میں پھیلاؤ کی وجہ سے تفصیلات کی زیادہ گنجائش ہے۔ افسانہ میں ہر بات اختصار اور اشاروں میں کہی جاتی ہے۔ ناول میں کرداروں کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں۔ افسانہ میں کرداروں کی تعداد کم سے کم ہوتی ہے۔ ناول میں قاری کی توجہ ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی طرف ہٹتی اور بڑھتی ہے۔ مختصر افسانہ میں اکثر کوئی ایک واقعہ ہی قاری کی توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے۔

در اصل مختصر افسانہ میں تاثر کی وحدت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یعنی افسانہ میں ابتداء سے آخر تک قاری کی توجہ جذب رہے۔ اور افسانہ نگار قاری کے دل میں جو کیفیت یا جو تاثر پیدا کرنا چاہتا ہے اس میں اسے کامیابی ہو۔

اُردو میں مغربی انداز کے حقیقت پسندانہ قصے تو انیسویں صدی میں ہی لکھے جانے لگے تھے۔ اور محمد حسین آزاد نے نیرنگ خیال کی شکل میں تمثیلی رنگ کے افسانے لکھے تھے لیکن اردو میں افسانہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی میں ہی ہوا۔ جب ”محزن زمانہ“ اور ”ادیب“ جیسے نئے ادبی رسائل شائع ہونا شروع

ہوئے۔ منشی پریم چند، سلطان حیدر جوش اور پھر سبھا دھیر یلدرم کے اردو میں مختصر افسانہ کے اولین نمونے پیش کئے۔ پریم چند کے افسانوں میں ہندوستان کی بدلتی ہوئی زندگی اور وطن پرستانہ جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اسی زمانہ میں سلطان حیدر جوش نے اصلاحی اور رومانی رنگ کے افسانے لکھنا شروع کئے۔ پریم چند اور اصلاحی تحریک کے دوسرے لکھنے والوں کی حقیقت نگاری اب پہلے سے زیادہ ٹھوس شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یلدرم اور دوسرے رومان نگار بھی زندگی اور زندگی کی واقعیت سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ افسانہ میں جذباتیت اور رومانیت کم ہو جاتی ہے۔ سماجی شعور بڑھ جاتا ہے۔ خود پریم چند کے فن میں زبردست انقلاب آتا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء میں ”کفن“ کی تخلیق ہوتی ہے۔

۱۹۳۶ء میں افسانوں کا ایک مجموعہ ”انگارے“ شائع ہوا۔ یہ گویا رومانیت سے بغاوت تھی۔ اس میں رشید جہاں، احمد علی، سجاد ظہیر اور محمود الظفر کے افسانے شامل تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ حقیقت نگاری کے ذریعے مروجہ قدروں پر چوٹ کی جائے۔ ان کا رویہ جارحانہ اور سنسنی خیز تھا جنسی معاملات میں ان افسانہ نگاروں نے بہت بے باکی سے کام لیا تھا۔

۱۹۳۶ء سے ہی ترقی پسند تحریک کا آغاز ہو جاتا ہے اور ادب کو زندگی سے قریب لانے کی کوشش سے افسانے کی مقصدیت میں نئی جان پڑ جاتی ہے۔ اور افسانہ نگاروں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، حسن عسکری اور متا ز مفتی نے کافی مقبولیت حاصل کی۔ پھر قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کا

زمانہ آج جس میں نئے موضوعات داخل ہوئے

کرشن چندر کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کے ہاں رومانیت، حقیقت نگاری، طنز و مزاح اور زبان کی لطافت موجود ہے۔ آزادی سے پہلے ان کے جن افسانوں نے شہرت پائی ان میں ”زندگی کے موڑ پر“، ”کالو بھنگی“ اور ”ان داتا“ شامل ہیں۔

بیدی کا لہجہ دھیمہ ہے وہ گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کا انتخاب کرتے ہیں۔ ”دانہ ودام“ اور ”کوکھ جلی“ نے خاصی مقبولیت حاصل کی۔ منٹو نے جنسیات کو اپنا موضوع بنایا اور ”ٹھنڈا گوشت“ جیسے افسانے لکھے۔ عصمت نے متوسط طبقے کے مسلمان گھرانوں کے لڑکے اور لڑکیوں کو موضوع قرار دے کر افسانے لکھے۔ ”چوتھی کا جوڑا“، ”چھوٹی موٹی“، ”بھول بھلیاں“ ان کے مشہور افسانے ہیں۔ حسن عسکری، ممتاز مفتی اور عزیز احمد نے بھی جنسی موضوعات پر لکھا، ملک تقسیم ہوا اور چاروں طرف فسادات ہوئے تو افسانہ نگار بھی اس خونین حادثے کی طرف متوجہ ہوئے۔ کرشن چندر نے ”ہم وحشی ہیں“، حیات اللہ انصاری نے ”شکتہ کنگورے“، منٹو نے ”ٹوبہ ٹیک سنگھ“، عصمت نے ”جڑیں“، انتظار حسن نے ”اجودھیا“، ہر قرة العین حیدر نے ”جلاوطن“ جیسے افسانے لکھے۔ اس طرح علامتی اور تجریدی افسانے کا وجود ہوا۔ بعض جدید افسانہ نگاروں نے افسانے کو چستان بنادیا اور فن کا پرانا تصور باقی نہ رکھا۔ وحدت تاثر کی شرط بھی باقی نہ رہی۔

اہم افسانہ نگار

اردو افسانے کی عمر زیادہ لمبی نہیں مگر چھوٹی سی عمر میں اس نے بہت ترقی کی۔ اس دور ان متعدد بلند پایہ افسانہ نگار پیدا ہوئے۔ اہم افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

پریم چند (۱۸۸۰ء-۱۹۳۶ء)

پریم چند افسانہ نگاروں کی فہرست میں سب سے نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ناول سے کیا ہے۔ افسانے بعد میں لکھے۔ ان کا پہلا افسانہ ”دنیا کا سب سے انمول رتن“ ہے۔ جو ۱۹۰۸ء میں ”رسالہ زمانہ“ کانپور میں شائع ہوا۔ اسی سال ان کے پانچ افسانوں کا مجموعہ ”سوز و طن“ کے نام سے شائع ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں ہر طرف بیداری کی لہر دوڑ رہی تھی اور آزادی کا مطالبہ زور پکڑ رہا تھا۔ انہوں نے دیہات کی زندگی کی کامیابی تصویر کشی کی ہے۔ سماجی مسائل کو پانی کہانی کا موضوع بنایا۔ آپ کی افسانہ نگاری کا موضوع اصلاح پسندی ہے۔ سماج کی برائیوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اردو کے افسانوی ادب کو ایک جاندار اور شگفتہ اسلوب عطا کیا۔

سجاد حیدر یلدرم (۱۸۸۰ء-۱۹۴۳ء)

پریم چند کے معاصرین میں ایک اہم نام سجاد حیدر یلدرم کا ہے۔ نہٹور ضلع بجنور ان کا وطن ہے۔ یہیں ۱۸۸۰ء میں ان کی ولادت ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ آئے۔ ترکی زبان و ادب سے انہیں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ لکھنؤ میں ۱۹۴۳ء میں وفات ہوئی۔

یلدرم کی یہ کوشش قابل ستائش ہے کہ انہوں نے تراجم کے ذریعے اردو ادب کے ذخیرے میں اضافہ کیا۔ یلدرم کے افسانوں میں رومانیت کا غلبہ ہے۔ زبان کی نفاست اور سجاوٹ پر ان کی توجہ اتنی زیادہ ہے کہ اکثر ناگوار ہوتی ہے۔ ”خیالستان“ جو ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں روسی اور انگریزی

اوپندر ناتھ اشک (۱۹۱۰ء-۱۹۹۶ء)

اوپندر ناتھ اشک پریم چند کے نامور معاصرین میں سے ایک ہیں۔ اور پریم چند سے خاص طور پر متاثر ہیں۔ ان کے افسانوں پر ایک لمبے عرصے تک ناصحانہ اور اخلاقی رنگ غالب رہا۔ اشک کے موضوعات میں سیاست موجود ہے مگر انداز اخلاقی اور اصلاحی ہے۔ اشک نے اپنے تمام تر وقت کو افسانہ نگاری پر صرف کیا۔ انہوں نے اردو افسانے کے ذخیرے میں بہت اضافہ کیا۔ ان کے مشہور افسانوی مجموعے ”کونیل“، ”دقفس“، ”ناسور“ وغیرہ اور ان مجموعوں کے بیشتر افسانوں کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا گیا۔

سدرشن (۱۸۹۶ء-۱۹۶۷ء)

پنڈت بدری ناتھ سدرشن کا زمانہ بھی وہی ہے جو پریم چند کا۔ سدرشن کے افسانے سیدھے سادے ہیں۔ واقعات کو ترتیب دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور افسانوں کو وہ شہر یاد بیہات میں قید نہیں کرتے۔ نہ امیروں یا غریبوں تک محدود کرتے ہیں بلکہ جہاں کہیں انہیں کوئی قابل ذکر بات نظر آتی ہے اسے اپنے افسانے میں سمو لیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی تعداد زیادہ نہیں۔

سلطان حیدر جوش (وفات: ۱۹۵۴ء)

سلطان حیدر جوش کا وطن بدایوں تھا۔ ابتدائی تعلیم دہلی میں پائی۔ جوش نے ایک خاص مقصد کو زندگی کا مشن بنالیا۔ انہوں نے دیکھا کہ اہل ہند اور خاص طور پر تعلیم یافتہ اصحاب یورپ کی اندھا دھند تقلید کرتے ہیں۔ پیروی کا یہ جوش اتنا شدید ہے کہ وہ اچھے اور برے کی تمیز بھی کھو بیٹھے ہیں۔ جوش نے اس کی خرابیاں واضح کرنے کے لیے مضامین لکھے، ناول لکھے اور افسانے لکھے۔

زبان و بیان کی طرف جوش بہت توجہ کرتے ہیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر الفاظ اور تراکیب لاتے ہیں۔ تشبیہیں تلاش کرتے ہیں، جس سے اکثر اسلوب میں بناوٹ کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔

اعظم کر یوی (وفات: ۱۹۵۵ء)

اعظم کر یوی کا وطن کرہ (ضلع الہ آباد) تھا وہیں ولادت ہوئی۔ ان کے افسانوں میں زندگی کا اصلی مواد موجود ہے اور اسے سادہ و دلکش انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ ان کا کینوس وسیع ہے۔ شہری زندگی، دیہاتی زندگی، زمینداروں اور امیروں کا رہن سہن، غریبوں اور مزدوروں کی تنگدستی سبھی کچھ انہوں نے اپنے افسانوں میں سمیٹ لیا ہے۔ اعظم کر یوی کی زبان سادہ ہونے کے ساتھ دلکش بھی ہے۔ مکالموں کی طرف ان کی خاص توجہ رہتی ہے۔ ان کے یہاں فارسی اور ہندی کے الفاظ بڑی کامیابی کے ساتھ گھل مل گئے ہیں۔

سعادت حسن منٹو (۱۹۱۲ء-۱۹۵۵ء)

اردو کے صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں منٹو کا شمار ہے۔ سعادت حسن کا تعلق کشمیر کی منٹو ذات سے ہے۔ وہ ۱۹۱۲ء میں سرالہ ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوئے، امرتسر میں تعلیم پائی۔ منٹو نے تصنیف و تالیف کی دنیا میں قدم رکھا تو پنجاب انقلابیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ یہ تحریک ان کے رگ و پے میں بھی سرایت کر گئی۔ انہوں نے مارکس کے نظریات اور گورکی کی تحریروں کا مطالعہ کیا۔ اور ان دونوں سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے مانوس ہو گئے۔ ان کا اصل میدان جنس ہے۔ سماج کی گندگی اور غلاظت کرید کر سماج کو صاف و شفاف رکھنے میں کوشاں رہے۔ ”ٹھنڈا گوشت“، ”کالی شلوار“، ”موزیل“، ”میرا نام رادھا ہے“ اور ”شاداں“ اسی قبیل کے افسانے ہیں۔ ”ٹوہ ٹک سنگھ“ اور ”ناقانون اس

رنگ سے ہٹ کر ہیں۔ منٹو نے کچھ لا جواب خاکے بھی لکھے۔ جو ”گنجد فرشتے“ کے نام سے شائع ہوئے۔ ان میں بے باک حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے۔ منٹو نے بہت لکھا اور نہایت سادہ انداز میں لکھا۔ ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں ”دھواں“، ”لذت سنگ“، ”خالی بوتلیں“، ”خالی ڈبے“، ”سیاہ حاشیے“، ”نمرود کی خدائی“، ”ٹھنڈا گوشت“، ”یزید“، ”چغند“ اور ”سڑک کے کنارے“ وغیرہ۔

راجندر سنگھ بیدی (۱۹۱۵ء - ۱۹۸۴ء)

بیدی اردو زبان کے بہت مقبول افسانہ نگار ہیں۔ وہ ۱۹۱۵ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر کی چار دیواری میں ہوئی۔ ان کی کم عمری میں ان کے چچا نے ایک چھاپ خانہ خریدا۔ اس کے ساتھ کئی ہزار کتابیں بھی ملیں۔ راجندر سنگھ کو بہت سی دلچسپی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ پڑھنے اور کہانیاں لکھنے کا شوق طالب علمی کے زمانے ہی میں پیدا ہو گیا۔ وہ بمبئی چلے گئے اور وہاں فلمی دنیا سے رشتہ قائم کر لیا اور فلمیں بھی بنائیں۔ ۱۹۸۴ء میں وہیں وفات پائی۔

راجندر سنگھ بیدی ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر رہے۔ اور اپنے افسانوں سے انہوں نے غریب و مظلوم طبقے کی حمایت کی۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بیدی نے اپنے افسانوں سے انہوں نے غریب و مظلوم طبقے کی حمایت کی۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بیدی نے اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ بیدی کی کہانیوں کا موضوع حقیقی زندگی کے انسان ہیں۔ جن کے دلوں میں طرح طرح کی آرزوئیں جنم لیتی ہیں۔ مگر پوری نہیں ہو پاتیں۔ بیدی کی زبان صاف ستھری، نکھری ہوتی لیکن بے جا تصنع اور غیر ضروری آرائش سے پاک ہوتی ہے۔ ”پان شب“، ”دس منٹ بارش میں“ اور ”تلا دان“ ان کے کامیاب افسانے ہیں۔

”داندو دام“، ”گرہن“، ”کو کھ جلی“، ”لمبی سڑک“، ”اے دھ بھے دیدو“ ان

کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

علی عباس حسینی (۱۸۹۷ء-۱۹۴۹ء)

ان کا وطن موضع بارہ (ضلع غازی پور) تھا۔ وہیں ۱۸۹۷ء میں ولادت ہوئی۔ حسینی کے افسانوں میں انسانی نفسیات موجود ہے۔ وہ ہر کردار کے ذہن کی تہوں کو اس طرح آہستہ آہستہ کھولتے ہیں کہ اس کی مکمل شخصیت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اس لیے حسینی کے کردار جاندار اور دلکش ہیں۔ حسینی نے سہل نگاری کو اپنایا۔ عربی، فارسی کے ثقیل اور نامانوس الفاظ سے گریز کیا اور آسان، عام فہم زبان میں افسانے لکھے۔ ہندی الفاظ بھی استعمال کئے۔ ”آئی سی ایس“، ”باسی پھول“ اور ”کچھ ہنسی نہیں ہے“، ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

اختر حسین رائے پوری (ولادت: ۱۹۱۲ء)

رائے پور (مدھیہ پردیش) ان کا وطن تھا۔ لیکن تعلیم علی گڑھ اور کلکتہ میں ہوئی۔ اپنی تحریروں سے انہوں نے ترقی پسند تحریک کو مستحکم کیا۔ افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ نقاد کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔ ان کے افسانوں میں رومانیت اور حقیقت نگاری کا امتزاج نظر آتا ہے۔ جب افسانہ لکھتے ہیں تو اکثر جگہ مضمون نگار کا سانس انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ ”محبت اور نفرت“ اور ”زندگی کا میلہ“ ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

کرشن چندر (۱۹۱۴ء-۱۹۷۷ء)

کرشن چندر اردو زبان کے نہایت مقبول اور ہر دلعزیز افسانہ نگار ہیں۔ پریم چند کے بعد کسی اور افسانہ نگار نے اردو افسانہ نگاری میں اتنا نام پیدا نہیں کیا۔ جتنا کرشن چندر نے۔ وہ ۱۹۱۴ء میں پنجاب میں پیدا ہوئے۔ بچپن کشمیر میں گزرا، تعلیم لاہور میں پائی اور زندگی کے آخری ایام بمبئی

میں گزارے وہیں ۱۹۷۷ء میں وفات پائی۔

ان کی افسانہ نگاری کی شروعات رومانی کہانیوں سے ہوئی۔ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ”طلسم خیال“ شائع ہوا۔ وہ اسی سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ انہوں نے ناول لکھے۔ ریڈیو ڈرامے لکھے۔ کہانیوں کے قابل ذکر مجموعے ہیں ”نظارے“، ”زندگی کے موڑ پر“، ”ٹوٹے ہوئے تارے“، ”ان داتا“، ”تین غنڈے“، ”سمندر دور ہے“، ”اجنتا سے آگے“، ”ہم وحشی ہیں“، ”دل کسی کا دوست نہیں“، ”میں انتظار کروں گا“، ”کتاب کا کفن“۔

جذبات نگاری کرشن چندر کے افسانوں کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ انسانی جذبات کی عکاسی میں انہیں بڑی مہارت حاصل ہے۔ ان کے افسانوں کی زبان بہت رنگین اور شیریں ہوتی ہے۔ کرشن چندر ایک بلند مرتبہ فن کار ہیں۔ ان کا فن زندگی کے بدلتے ہوئے ذرائع کے ساتھ چلتا ہے۔ کرشن چندر وہ راہ دکھانا چاہتے ہیں جو ترقی اور امن کی طرف جاتی ہے۔

عصمت چغتائی (۱۹۱۵ء-۱۹۹۱ء)

جن افسانہ نگاروں نے اردو افسانے پر ایک دائمی نقش چھوڑا، ان میں ایک نمایاں نام عصمت چغتائی کا ہے۔ ان کا آبائی وطن راجستھان ہے۔ وہیں ان کی ولادت اور ابتدائی تعلیم ہوئی۔ بی اے، بی ایڈ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔ لکھنے کی ابتدائی تربیت وہیں سے ملی اور وہیں سے ناول اور افسانے کا اولین مواد بھی فراہم ہوا۔ بمبئی میں مدارس کی انسپکٹریں مقرر ہوئیں۔ وہیں فلمی دنیا سے رابطہ قائم ہوا۔ آخر کار ملازمت ترک کر کے تصنیف و تالیف میں ہمہ تن مصروف ہو گئیں، ۱۹۹۱ء میں وفات پائی۔

انہوں نے افسانوی ادب میں خاص میدان کا انتخاب کر لیا۔ متوسط گھرانوں

کے لڑکوں اور لڑکیوں کی زندگی ان کے فلشن کا موضوع ہے۔ عصمت چغتائی کی زبان بہت دلکش ہے۔ عورتوں کی زبان پر انہیں بطور خاص مہارت حاصل ہے۔ اپنے محدود کینوس کے باوجود عصمت چغتائی نے افسانہ نگاری میں ایسی فنکارانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے کہ انہیں برسوں یاد رکھا جائے گا۔

”کلیاں“، ”چوٹیں“، ”چھوٹی موٹی“ اور ”دو ہاتھ“ ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

فترۃ العین حیدر (ولادت: ۱۹۲۷ء)

قرۃ العین حیدر کا آبائی وطن نہٹور ضلع بجنور ہے۔ ان کی ولادت ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ ان کے والد سید سجاد حیدر یلدر کا شمار اردو افسانے کے بنیاد گزاروں میں کیا جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر ان افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جن کے افسانے بہت جدید ہونے کے باوجود بے حد پرکشش ہیں۔ ان کا افسانہ ”سینٹ فلور آف جار جیا کے اعترافات“ اس کی مثال ہے۔ ”ستاروں سے آگے“، ”شیشے کے گھر“، ”پت جھڑکی آواز“، ”روشنی کی رفتار“ ان کی کہانیوں کے مجموعے ہیں۔ ان کا مشاہدہ گہرا ہے۔ مگر وہ بالعموم اعلیٰ طبقے کو ہی اپنی توجہ کا مرکز بناتی ہے۔ قرۃ العین حیدر اجتماعی شعور کی بازیافت کرتی ہیں اور ہزاروں سال پر پھیلی ہوئی زندگی ان کے چند صفحات میں سمٹ آتی ہے۔ قدیم ہندوستانی تہذیب اور فلسفہ ان کے شعری اسلوب میں ڈھل کے کبھی ناول کا روپ اختیار کرتا ہے۔ تو کبھی افسانے کا۔ ان کے یہاں کہانی پن، سماجی آگہی اور تاریخی بصیرت مل کر ایک وحدت بن جاتے ہیں۔ اس طرح ذہنی فصاحت کی پیشکش اور کرداروں کے نفسیاتی ردِ عمل کی تصویر کشی میں انہیں بڑی مہارت حاصل ہے۔ زمان و مکان کی قد بھی ٹوٹ جاتی ہے۔

سہیل عظیم آبادی (۱۹۱۱ء-۱۹۷۹ء)

سہیل عظیم آبادی اردو کے ایک نامور افسانہ نگار ہیں۔ پریم چند کی روایت بہار کی سرزمین پر انہی کے دم سے آگے بڑھی۔ مولوی عبدالحق کی سرپرستی میں انہوں نے بہار میں اردو کے فروغ کی تحریک چلائی۔ اپنے مشہور اخبار ”ساتھی“ سے انہیں اس کام میں بہت مدد ملی۔ اس کے علاوہ ماہنامہ ”تہذیب“ نے بھی اس مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ سہیل عظیم آبادی نے بہت سے افسانے لکھے اور ان افسانوں میں حقیقی زندگی کے مرقعے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ ان کے افسانوں کا دائرہ وسیع ہے۔

سہیل عظیم آبادی پر ترقی پسند تحریک کا اثر بھی صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ انہوں نے غریبوں اور مظلوموں کی حمایت میں آواز اٹھائی اور اپنے افسانوں میں ان کے مسائل کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا۔ وہ ایک کامیاب فن کار ہیں۔ ان کے فن میں گہرائی ہے۔ کیونکہ وہ مسائل پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں۔ وقار عظیم لکھتے ہیں:

”سہیل کے افسانوں میں نہ زندگی پر زیادہ زور پڑتا ہے اور نہ فن پر۔ ان کے یہاں طنز ہے۔ اس میں تلخی نہیں۔ ادبیت ہے لیکن اس کا شاعرانہ عنلو نہیں۔ زندگی کی سچائی ہے لیکن اس میں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں۔ ان کے افسانے زندگی کے اضطراب لیکن حق کے سکون کے پیامی ہیں۔“

چونکہ اردو میں افسانہ نگاروں کی کمی نہیں اور یہ فہرست کافی لمبی ہے۔ ان مختصر صفحات میں کئی اہم افسانہ نگار بھی چھوٹ گئے۔ یہاں ان کے نام لئے جاتے ہیں۔

اختر انصاری، مجنون گورکھپوری، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، عزیز احمد، ہنس راج رہبر، ممتاز مفتی اور محمد حسن عسکری وغیرہ وغیرہ۔

انشائیہ

انشائیہ کی صنف اردو میں انگریزی سے آئی۔ انگریزی میں اسے ”ایسے“ کہتے ہیں۔ عام طور پر اردو کے اخباروں اور رسالوں میں کسی خاص موضوع پر صحافتی یا علمی انداز کے جو مضامین یا مقالے لکھے جاتے ہیں۔ انشائیہ ان سے مختلف ہوتا ہے۔ ان مضامین میں معلومات اور سنجیدہ دلائل پر سارا زور صرف ہوتا ہے جب کہ انشائیہ میں انشائیہ نگار بے تکلف بے ساختہ اور غیر علمی انداز سے اپنی بات کہتا ہے اور زیادہ تر اپنے تجربہ اور اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنیاد پر ہی اپنے تاثرات بیان کرتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی خاص اصلاحی مقصد نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنی دل کی باتیں مزہ لے لے کر بیان کرتا ہے۔ لیکن ان باتوں میں تازگی ندرت اور شگفتگی ہونا ضروری ہے۔ اس کے تجربے زندگی پر ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالتے ہوں۔ ساتھ ہی اس کی اپنی ذات اور شخصیت کا انکشاف بھی کرتے ہوں۔

انشائیہ نگار بات میں سے بات پیدا کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اردو میں عبدالحلیم شرر، فرحت اللہ بیگ، سجاد انصاری، رشید احمد صدیقی وغیرہ نے اعلیٰ معیار کے انشائیہ لکھے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے ادیبوں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ دور حاضر میں نظر صدیقی، وزیر آغا، انور سدید، مجتبیٰ حسین، محمد زماں آذرہ نے اس صنف کی طرف توجہ دی ہے اور کامیاب انشائیے لکھے ہیں۔

انشائیہ میں کسی اہم یا غیر اہم واقعے، کسی خیال، کسی جذبے یا محض کسی لحاتی کیفیت کو پر لطف انداز میں پیش کر دیا گیا ہو۔ انشائیہ کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس

کی کوئی شرط نہیں، کوئی اصول نہیں جو کچھ کہو اس طرح کہو کہ پڑھ کر جی خوش ہو جائے اور پڑھنے والے کے ذہن میں گدگدی نہ ہونے لگے۔

وزیر آغا انشائیہ کے بارے میں فرماتے ہیں ”انشائیہ کا خالق اس شخص کی طرح ہے جو دفتر کی چھٹی کی بعد اپنے گھر پہنچتا ہے۔ چُست و تنگ کپڑے اُتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیتا ہے۔ اور ایک آرام دہ مونڈھے پر نیم دراز ہو کر حقے کی نئے ہاتھ میں لئے انتہائی بشاشت اور مسرت سے اپنے احباب سے محو گفتگو ہو جاتا ہے۔“

انشائیہ میں حکمت و حماقت اور مقصدیت و بے مقصدیت اس طرح آپس میں گتھ جاتے ہیں کہ ان کا الگ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ہاں ایک شے ایسی ہے جو انشائیہ کے آئینے میں صاف نظر آتی ہے وہ انشائیہ نگار کا اپنا عکس۔ یہ ایک ایسی شخصی تحریر ہے جس میں مصنف کی شخصیت پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے۔

سید محمد حسنین نے درست فرمایا ہے ”کہ انشائیہ نگار کے لیے قوت انشاء سے خاطر خواہ مصرف لینا ضروری ہے۔ یعنی انشائیہ کی اس امتیازی خصوصیت کو قائم رکھنا اس کی ہوشیاری ہے۔ ذہن میں آنے والے خیالات کو اسے آوارہ گردی اور وحشت سے بچانا چاہیے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ انہیں آزاد و خود مختار نہ چھوڑے۔ انہیں قابو میں رکھے۔ ان میں تسلسل اور ربط قائم کرے لیکن اس بات کا شعور بھی ضروری ہے کہ خیالات میں وہ سالمیت اور تنظیم اور اتحاد پیدا نہ ہونے دیں جو مقالوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔

انشائیہ نگار

انشاء نگاری عالمی ادب میں ایک نو مولود صنف ہے۔ اس لیے کسی فن پارے

میں انشائیہ کی ایک خصوصیت ملتی ہے۔ تو کسی میں دوسری خصوصیت اس لیے صحیح فیصلہ دشوار ہو جاتا ہے۔ بعضوں نے تو مٹلا و جہی کی ”سب رس“ میں اس کی اولین جھلک دیکھی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کے عہد کو انشائیہ کی صحیح کاذب اور رشید احمد صدیقی کے دور کو انشائیہ کی صحیح صادق کہا گیا ہے اور یہ خیال بالکل درست ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد (۱۸۳۲ء۔ ۱۹۱۰ء)

آزاد کے قلم میں عجیب جادو ہے۔ شبلی کا قول ہے کہ ”وہ گپ بھی ہانک دے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔“

آب حیات، دربار اکبری، نیرنگ خیال ان کی وہ تصانیف ہیں جن کے مختلف حصوں پر کبھی افسانے کا دھوکہ ہوتا ہے۔ کبھی خاکے کا گمان گزرتا ہے۔ کہیں انشائیہ کا عکس نظر آتا ہے۔ نیرنگ خیال کے شہ پاروں کو تو انشائیوں کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰ء۔ ۱۹۲۶ء)

لکھنؤ کی زبان شرر کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ ان کی بیشتر تصانیف فکشن کے ذیل میں آتی ہیں۔ لیکن انداز بیان ایسا بے تکلف اور دلکش ہے کہ جگہ جگہ انشائیہ کا دھوکا ہوتا ہے۔ ان کے مضامین میں ہلکے پھلکے مضمون بھی موجود ہیں جو انشائیہ کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔

حسن نظامی (۱۸۷۸ء۔ ۱۹۳۷ء)

خواجہ حسن نظامی کا شمار اردو کے صاحب طرز انشاء پردازوں میں ہے۔ زبان بہت دلکش اور انداز بیان بہت پُر تاثیر ہے۔ ”گل بانو“ اس کی اچھی مثال ہے۔ ”جھینگر کا جنازہ“ اور ”گلاب تمہارا کیکر ہمارا“ ایسے شاہکار ہیں جو انشائیہ کی کڑی سے کڑی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی (۱۸۹۸ء-۱۹۷۷ء)

رشید احمد صدیقی کی نگارشات میں انشائیہ نگاری کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ آپ مزاح نگار بھی ہیں مگر ان کی بیشتر تحریریں انشاء نگاری کے ذیل میں آجاتی ہیں۔ ”ارہر کا کھیت“ اور ”وکیل“ ان کے بے حد مقبول انشائے ہیں۔ ”مغالطہ“، ”گھاگ“ اور ”چار پائی“ ایسے انشائے ہیں جن کی دلکشی کبھی کم نہ ہوگی۔

پطرس بخاری (۱۸۹۸ء-۱۹۵۸ء)

احمد شاہ بخاری پطرس کے مضامین اردو ادب میں بہت مقبول ہیں۔ دراصل یہ مضامین کم اور انشائے زیادہ ہیں وہ سامنے کی زندگی سے کوئی موضوع انتخاب کر لیتے ہیں۔ اور اس کے بارے میں ایسی دلچسپ اور معنی خیز باتیں کہتے ہیں کہ پڑھنے والے کو بے حد لطف آتا ہے۔ ”لاہور کا جغرافیہ“، ”مکتے“، ”سینما کا عشق“ ان کے عمدہ انشائے ہیں۔ ان کے انشائے ”مکتے“ کو اب بھی بہت دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔

یہاں چند انشائیہ نگاروں کا ذکر کیا گیا۔ ان کے علاوہ عہد حاضر میں بہت سے انشاء نگار اردو ادب میں نہایت مقبول ہیں جیسے سید محمد حسنین، یوسف نام، احمد جمال پاشا، مشتاق یوسفی، کرنل محمد خان، شوکت تھانوی، کھنیا لال کپور، شفیقہ فرحت، حاجی لق دق وغیرہ۔ ان کی تحریروں میں بلند پایہ انشائیوں کی کمی نہیں۔

اب اس صنف کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی جا رہی ہیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب میں اسے بہت فروغ حاصل ہوگا۔

داستان

کہانی انسانی سماج اور انسانی شعور کے ارتقاء کی تاریخ ہے جیسے جیسے انسان کی سماجی زندگی ترقی کرتی گئی اور اس کے علم و شعور کی حدیں بڑھتی گئیں ویسے ویسے کہانی کا مواد اور اس کے موضوعات بھی بدلتے گئے اور وہ رفتہ رفتہ ترقی کرتی ہوئی حکایات، تمثیل، داستان، ناول اور افسانہ کی منزل تک پہنچ گئی۔

داستان ایسی رومانی کہانی کو کہتے ہیں جس میں خیالی واقعات کا بیان، مافوق الفطرت عناصر کی تخریزی، حسن و عشق کی رنگینی، واقعات و حادثات کی بہتات و پیچیدگی اور بیان کی لطافت ہو اور اس کا مقصد اپنے قاری کو فرحت و مسرت کا سامان فراہم کرتا ہو۔

داستانیں ایسے دور میں رواج پذیر ہوتی ہیں جو سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے زوال کا زمانہ کہلاتا ہے کیونکہ ایسے زمانہ میں انسان زندگی کی ہماہمی، مستقل جدوجہد، ناکامیوں اور نامرادیوں سے تنگ آکر ایسے گوشہ عافیت کی تلاش کرتا ہے جو اس کی روح کو تسکین پہنچا سکے۔ جو اس کے خوابوں کی تعبیر اور اس کی شکستہ آرزوؤں کا مرہم ہو۔ یہ تمام سرمایہ نشاط و انبساط داستانوں کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان داستانوں کی ابتداء کس طرح ہوئی اور کس طرح انہوں نے ارتقاء کی منزلیں طے کیں۔ ہندوستان ہمیشہ سے قصہ کہانیوں کا ملک رہا ہے۔ یہ دیوی دیوتاؤں کی جنم بھومی ہے۔ یہاں مہا بھارت، رامائن، سنت اور

اُپدیش جیسے قصے کہانیوں نے جنم لیا ہے۔ شاہی درباروں اور عوام میں ان کا رواج رہا ہے۔ درباروں میں تو جس طرح دوسرے اہل علم و فن ملازم رکھے جاتے تھے اسی طرح داستان گو بھی ملازم رکھے جاتے تھے۔ جو بادشاہوں کو داستانیں سنایا کرتے تھے۔ ہمارے بہت سے قصے اور داستانیں ایسی ہیں جو پہلے سنسکرت میں لکھی گئیں اور یہاں سے وہ عرب و ایران گئیں۔ عربی و فارسی میں ان کے ترجمے ہوئے اور عربی و فارسی کے ذریعہ وہ اردو میں آئیں۔ مثلاً بیتال پچھسی، کلیدہ و دمنہ، سنگا سن بتی، گل بکاؤلی اور طوطا کہانی وغیرہ۔ کچھ داستانیں ایسی ہیں جو عرب و ایران میں تصنیف ہوئیں اور مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں آئیں اور یہاں ان کے اردو تراجم ہوئے۔ جیسے سب رس، الف لیلیٰ وغیرہ۔ اس کے علاوہ کچھ داستانیں ایسی بھی ہیں جو پہلے پہل ہندوستان ہی میں فارسی میں لکھی گئیں اور بعد میں ان کے اردو میں ترجمے ہوئے۔ مثلاً طلسم ہوش رُبا، باغ و بہار، کچھ داستانیں اردو کی طبع زاد ہیں جیسے فسانہ عجائب اور سرودش سخن وغیرہ۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد اردو کی داغ بیل پڑی۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنی ارتقائی منزلیں طے کیں اور کئی سو برس کے بعد وہ اس قابل ہوئی کہ اس میں کچھ لکھا جاسکے۔

اردو میں داستانوں کی ابتداء اُن منظوم قصوں سے ہوئی ہے جو دکن میں لکھے گئے۔ یہ منظوم قصے عسکری، رزم و بزم کی معرکہ آرائیوں، حبس وصال کی لذتوں اور مافوق الفطرت عناصر کی تخیل خیزیوں سے معمور ہیں۔ اس دور کی چند مشہور منظوم داستانیں درج ذیل ہیں:

غواصی کی مثنوی، سیف الملوک جو الف لیلیٰ کی مشہور داستان ہے۔ نصرتی کی مثنوی گلشن عشق جو عشق و محبت کی داستان ہے۔ اسی شاعر کی دوسری مثنوی علی نامہ

ہے۔ وجہی کی مثنوی قطب مشتری بھی ایک عشقیہ داستان ہے۔

شمالی ہندوستان کے منظوم قصوں میں میر تقی میر کی مثنوی ”شعلہ عشق“، ”دریائے عشق“ میر اثر کی مثنوی خواب و خیال، میر حسن کی مثنوی ”سحر البیان“ اور دیاشکر نسیم کی مثنوی ”گلزار نسیم“ اپنی خوبیوں اور اثر انگیزی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان منظوم قصوں نے جزوی طور پر منظر نگاری جذبات نگاری اور زبان و بیان کا ایسا مواد عطا کیا ہے جو آئندہ چل کر اردو نثر کی ابتداء اور ارتقاء میں مفید و معاون ثابت ہوا۔

ابھی ہماری نثری داستانیں اپنی ابتدائی منزلوں پر تھیں کہ فورٹ ولیم کالج ۱۷۹۹ء کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ جب انگریز صوبہ بنگال پر پوری طرح قابض ہو گئے تھے اور صوبہ بہار و اڑیسہ کی مالگذاری وصول کرنے کے اختیار است بھی انہیں حاصل ہو گئے تو انہیں اپنی سلطنت کو فروغ دینے اور اسے مستحکم بنانے کے لیے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ ہندوستان کی ذہنیات کو سمجھیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ جہاں انگریزوں کو ہندوستانی زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی چونکہ اردو میں اس وقت تک اس قسم کی کتابیں موجود نہیں تھیں۔ جن کے ذریعہ مبتدی کو تعلیم دی جاتی، چنانچہ اس مقصد کے لیے اردو نثر میں کتابیں تصنیف کرانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے چند اہل کمال کو منتخب کیا گیا۔ جن کا کام یہ تھا کہ دوسری زبان مثلاً فارسی اور سنسکرت کی ایسی کتابوں کو اردو نثر میں منتقل کریں جو مبتدی آسانی اور دلچسپی سے پڑھ سکیں اور ہندوستانی معاشرے کے بارے میں علم حاصل کر سکیں۔ چنانچہ قصہ کہانیوں اور داستانوں کا انتخاب کیا گیا جو اس مقصد کو بہ آسانی پورا کر سکتی تھیں۔ فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام جو داستانیں اردو نثر میں ترجمہ ہو کر منظر عام پر

آئیں ان میں سے چند مشہور و معروف داستانوں کے نام درج ذیل ہیں۔

میرامن کی باغ و بہار، حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل اور طوطا کہانی، خلیل علی خان اشک کی داستان امیر حمزہ ”نثر بے نظیر“ از بہار علی حسینی اور مظہر علی والا ولولال کی بیتال پچھسی وغیرہ۔

فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ جب داستانیں چھپ کر منظر عام پر آئیں تو دوسرے ادیب بھی اس طرف متوجہ ہوئے۔ رجب علی بیگ سرور نے باغ و بہار کے جواب میں فسانہ عجائب لکھی۔ اس کے علاوہ دوسرے مصنفین نے بھی بہت سی داستانیں تصنیف و ترجمہ کیں اور یہ سلسلہ انیسویں صدی کے آخر تک چلتا آ رہا۔

داستان کی خوبی یہ بتائی گئی ہے کہ قصہ اس طرح بیان کیا جائے کہ اس میں تاریخ گزشتہ کا لطف محسوس ہو۔ چنانچہ ان داستانوں میں بھی قصہ اس طرح شروع کیا جاتا ہے کہ واقعی کسی زمانے میں کوئی بادشاہی ہوا تھا۔ ان داستانوں کے پلاٹ میں بھی عام طور پر یکسانیت پائی جاتی ہے۔ یہ تمام داستانیں بادشاہوں، شہزادوں اور وزیروں سے متعلق ہوتی ہیں۔ شہزادہ کسی کی زبانی شہزادی کی تعریف سن کر یا خواب میں دیکھ کر عاشق ہوتا ہے۔ پھر اس کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ جنگلوں، صحراؤں کی خاک چھانتا ہے۔ راستہ میں مشکلات سے دوچار ہوتا ہے۔ کبھی دیو، جن، پری اس کی مدد کرتے ہیں کبھی تائید نہیں حاصل ہوتی ہے۔ کبھی یہ تمام چیزیں اس کے راستہ میں حائل ہو کر مزید مشکلات پیدا کرتی ہیں اور داستان کا ہیرو سب پر فتح حاصل کرتا ہوا منزل مقصود پر پہنچتا ہے اور محبوبہ کو حاصل کر کے بامراد گھر واپس آتا ہے۔ اس قسم کے عشق و محبت کی تلاش ہماری مشہور داستانوں، چہار درویش، فسانہ عجائب، بوستان خیال وغیرہ میں ملے گی۔ ان داستانوں کا اختتام بھی طریبہ ہوتا ہے کیونکہ ہمیشہ ہیرو کی فتح ہوتی ہے۔ ان داستانوں میں اگر خیر و شر کی کشمکش ہے تو فتح ہمیشہ خیر کی ہوتی ہے۔

داستان کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ رومانی، تخیلی اور غیر حقیقی ہوں۔ لیکن کوئی ادب خلا میں پیدا نہیں ہوتا۔ ادیب جو اس دنیا کا ہی ایک فرد ہے گرد و پیش کے حالات سے کس طرح محفوظ رہ سکتا ہے؟ چنانچہ ان داستانوں میں ہمیں زندگی کا عکس بھی ملتا ہے۔ ان میں طبقہ اعلیٰ کی معاشرت، لکھنؤ اور دہلی کی معاشرت کے واضح اور دھندلے نقوش بھی ملتے ہیں۔ باغ و بہار اور فسانہ عجائب اپنے دور کی معاشرت کی ترجمانی کے لیے مشہور ہیں۔

داستانوں میں ہمیں دو طرح کے اسلوب ملتے ہیں ایک سادہ، سلیس، بامحاورہ اور دوسرا رنگین، مسجع و مقفی باغ و بہار، مذہب عشق، آرائش محفل، رانی کیتکی کی کہانی، سادہ اسلوب بیان کی مثالیں ہیں۔ ان کے برخلاف نو طرز مرصع، فسانہ عجائب، گل صنوبر، شگوفہ محبت، سروش سخن، طلسم حسرت وغیرہ میں رنگین طرز نگارش ملتا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں ہندوستان میں، قصوں داستانوں کا عام رواج تھا لیکن باقاعدہ تصنیف و تالیف کی ابتداء نو طرز مرصع سے ہوئی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اس صنف کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی اور انیسویں صدی کے ربع آخر تک بے شمار داستانیں لکھی گئیں۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ فورٹ ولیم کالج سے قبل اردو نثر کی اہمیت کا احساس نہیں تھا۔ اسے کم مایہ سمجھا جاتا تھا لیکن جیسے ہی فورٹ ولیم کالج نے معیاری نثر میں افسانوی ادب پیش کیا تو ہندوستانی ادیبوں کو بھی اس کی اہمیت کا احساس ہوا۔ اس کے علاوہ اس سو سال کی مدت میں بد امنی اور سیاسی بحران کی وجہ سے بھی خواب آفرین تخیل، داستانوں کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ اس دور کا قاری حقیقی زندگی کی تخیلوں اور اُلجھنوں سے الگ داستانوں میں ایک سنگین تخیل دیکھتا تھا۔ ادیبوں کی بیشتر تخلیقیں ترجمانی اور دوسری

زبانوں سے ماخوذ ہیں۔ جو طبع زاد ہیں ان میں فکر و نظر کی وہ گہرائی نہیں جو اعلیٰ ادب کا خاصہ ہے۔ آج کے قاری کو ان میں وہ دلچسپی یا نشاط و انبساط کی وہ کیفیت بھی نہیں ملتی جس کے لیے زوال پذیر جاگیر دارانہ دور میں وہ لکھی گئیں تھیں۔ سحر و افسوں کی اس دنیا سے انسانی زندگی کے حقائق اور مسائل کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ اس لیے ادب میں ان کی اہمیت تاریخی اور لسانی ہے۔ یہ داستانیں الفاظ کا ایک بحرِ خار ہیں اور اس بحر میں محاوروں، کہاوتوں، تشبیہوں، استعاروں، تمثیلوں اور تراکیب کے بیش بہار جواہرات پوشیدہ ہیں۔ اس خزانہ سے حسبِ ضرورت ہمارے ادیبوں نے فائدہ اٹھایا ہے اور اٹھائے رہیں گے۔ داستانیں اردو نثر میں جاگیر دارانہ دور کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔

ڈراما

ڈراما شاعری کی سب سے قدیم صنف ہے۔ ہندوستان اور یونان دنیا کے دو ملک ہیں جہاں ڈرامے نے پہلے آنکھیں کھولیں۔ چنانچہ ڈرامے کے اصول بھی سب سے پہلے یہیں زیر غور آئے۔ بھرت منی نے ہندوستان میں اور ارسطو نے یونان میں ڈرامے کے مسائل پر غور کیا اور اس کے اصول وضع کئے۔

بھرت منی: (۱) لباس (۲) آواز (۳) جسمانی اعضاء کی حرکت (۴) رقص اور (۵) موسیقی کو ڈرامے کے لازمی اجزاء بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ڈرامے سے ناظرین کے دلوں میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اس کیفیت کو وہ اس کا نام دیتے ہیں۔ اور اس کی آٹھ قسمیں گنا تے ہیں جو ہیں: (۱) محبت (۲) نفرت (۳) بہادری (۴) غصہ (۵) ظرافت (۶) خوف (۷) حیرت اور (۸) غم۔

ارسطو ڈرامے کے لیے: (۱) قصہ (۲) کردار (۳) مرکزی خیال (۴) مکالمہ (۵) موسیقی اور (۶) اسٹیج کی آرائش کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اسی لیے ارسطو نے ڈرامے کو عمل کی نقل کہا ہے۔

ڈراما زندگی کی ایسی نقل ہے جو اداکاروں کے ذریعے دیکھنے والوں کے سامنے اس طرح پیش کی جاتی ہے کہ بالکل سچی اور اصلی معلوم ہو۔

ڈرامے کے اجزائے ترکیبی چار کہے جاسکتے ہیں (۱) قصہ یا پلاٹ (۲)

قصہ یا پلاٹ کردار کے ذہنی ارتعاشات، قلبی واردات اور اس کے افعال و اعمال سے مرتب ہوتا ہے۔ قصہ کے واقعات جب ایک خاص نظم و ضبط کے پابند ہوتے ہیں۔ ان میں ایک بامعنی اور باطنی ربط و آہنگ اور فطری تسلسل پیدا ہو جاتا ہے۔ تو اسے پلاٹ کہتے ہیں۔ پلاٹ گہرا بھی ہوتا ہے اور تہہ دار بھی۔ ایک کامیاب ڈرامے میں واقعات اس طرح آگے بڑھتے ہیں کہ دلچسپی میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کے لیے ڈرامہ نگار کو تخیل سے کام لینا پڑتا ہے چونکہ ڈرامہ زندگی کی عکاسی کا نام ہے اس لیے ضروری ہے کہ ڈرامہ میں جیتے جاگتے کردار پیش کئے جائیں۔ ان کی گفتگو، افعال اور جذباتی حالت میں حقیقت کا رنگ ہو، اعلیٰ درجہ کی سیرت نگاری ڈرامہ کافن، کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر عابد حسین ”ڈرامہ کے اشخاص خود اپنی گفتگو، اپنے عمل سے اپنی سیرت کا اظہار کرتے ہیں“۔

مکالمہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے ڈرامہ کی روح ہوتا ہے۔ پلاٹ کی تشکیل، سیرت نگاری اور اپنے مقصد کو موثر طریقہ سے پیش کرتے ہیں۔ ڈرامہ نگار مکالمہ ہی سے کام لیتا ہے یوں تو دورِ جدید سے قبل ڈرامہ کے مکالمے منظوم اور شعرا نہ بھی ہوتے تھے لیکن جیسے جیسے ڈرامہ عام انسانی زندگی سے قریب ہوتا گیا۔ اس کے مکالموں میں بھی فطری سادگی پیدا ہوتی گئی اور نثر کا استعمال بڑھتا گیا۔ ڈرامہ نگار ہر قدم پر اس کا لحاظ رکھتا ہے کہ مکالمہ برجستہ رواں اور موثر ہو۔ اس کی ادائیگی میں فطری سہولیت ہو اور وہ اشخاص قصہ کی بدلتی ہوئی جذباتی اور ذہنی حالت کا آئینہ دار ہو۔ مغرب میں ڈرامہ کو اس کے داخلی مزاج اور اثرات کے نقطہ نظر سے المیہ اور طربیہ دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ المیہ ایسے ڈراموں کو کہا جاتا ہے جن میں جہل و پل و اس اور شکست و محرومی کے جذبات غالب ہوں اور جن کا مجموعی اثر غم

انگیز اور حسرت آگیز ہو لیکن اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ بعض المیہ ڈرامے ایسے ہوتے ہیں جن کی کہانی اور مجموعی فضا نقطہ عروج تک رنج و غم سے معمور ہوتی ہے لیکن جن کا انجام بخیر ہوتا ہے۔

ایسا ڈرامہ جس میں فرحت و مسرت کی فراوانی ہو یا ظرافت ہو اور اس کا مجموعی اثر بھی طمانیت بخش اور خوش کن ہو طریبیہ کہلاتا ہے۔ المیہ کی طرح اس میں بھی ملے جلے احساسات کی کار فرمائی ہو سکتی ہے۔ مگر انجام مسرت آمیز ہوتا ہے۔ قدیم ہندوستان ڈراموں میں محض انبساطی کیفیت ہی کا رواج رہا۔ فرصت و فراغت کے لمحات کم ہونے کے ساتھ ساتھ ڈرامے کی ایک اور صنف وجود میں آئی یہ ریکائی یا ایکٹ کا ڈرامہ ہے۔ اس میں فن کے تمام لوازمات کے ساتھ عمل ایک نقطہ پر مرکوز ہوتا ہے۔

ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے لیے جو ڈرامے لکھے جاتے ہیں ان کو نثری ڈرامے کہا جاتا ہے۔ ان میں مسائل اور مقاصد تمام ڈراموں کی طرح ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی تدبیر گری میں فرق یوں پیدا ہو جاتا ہے کہ یہاں تمام تر اثر سماعت و بصر کے ذریعہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہاں سامع الفاظ سے تخیلی شکلیں بناتا ہے اس طرح بعض خاص پابندیوں کے ساتھ ڈرامہ نگار کی بعض ذمہ داریاں کم بھی ہو جاتی ہیں۔ وہ خود کو زمان و مکان کی قید سے آزاد کر کے مختلف زمانوں پر پھیلا سکتا ہے۔

اردو کے اولین ڈرامے

اردو کے اولین ڈرامے لکھنؤ میں لکھے گئے اور ایچ پرپیش کئے گئے۔ اردو ڈرامہ کی ابتداء واجد علی شاہ کے ڈرامے ”رادھا کنہیا“ کے قصہ سے ہوتی ہے جسے ایچ پر ہرسل کے انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ ایچ کے لیے واجد علی شاہ نے اپنی

بعض مثنویوں کو بھی ڈرامے کی شکل دی۔ اسی شاہی ذوق و شوق کے نتیجے میں لکھنؤ میں ڈرامے کا عام شوق پیدا ہوا اور ”امانت علی خان“ کی ”اندر سبھا“ جیسی بے مثل تمثیلی تخلیق وجود میں آئی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر کے آغاز میں ہی پارسی اردو تھیٹر کا آغاز ہوا۔ ”اندر سبھا“ کے زیر اثر ان ڈراموں میں رقص و سرور کے عناصر کا زور رہا۔ روایتی، رومانی قصے ڈرامے کی شکل میں پیش کئے گئے۔ ان ڈراموں میں ظرافت کو بھی خاص جگہ دی جاتی تھی۔

۱۸۸۰ء کے بعد طالب بنارس، احسن لکھنوی اور بیتاب بریلوی جیسے باشعور ادیب ان کمپنیوں سے وابستہ ہوئے تو اردو ڈرامہ کو ایک نیا آہنگ اور وقار ملا۔ طالب نے نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں مکالمے لکھے اور اردو گیتوں کو ان میں شامل کیا۔ حسن لکھنوی نے شیکسپیر کے ڈراموں کے آزاد ترجمے ”خونِ ناحق“ اور ”گلنار فیروز“ پیش کر کے ڈرامے میں ایک ادبی شان پیدا کر دی۔ بیتاب نے ہندی دیومالا اور مذہبی قصوں کو ڈرامائی رنگ میں پیش کیا۔ ”کرشن سداما“، ”رامائن مہابھارت“ اور ”فریبِ محبت“ ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔

آغا حشر نے پہلی بار ڈرامہ کے فن کی طرف توجہ دی اور اس کے فنی معیار کو بلند کیا۔ انہوں نے ڈرامہ کا رخ نظم سے نثر کی طرف موڑا۔ ملک کے معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا۔ انہوں نے بڑی تعداد میں ڈرامے لکھے۔ شروع میں پارسی کمپنیوں کے لیے پھر خود اپنی تھیٹر ریکل کمپنی کے لیے حشر کے نمائندہ ڈراموں میں ”اسیرِ حرص“، ”شہیدِ ناز“، ”یہودی کی لڑکی“، ”خوابِ ہستی“ اور ”رستم و

سہراب“ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

دورِ عروج

ڈرامہ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر ہمارے بڑے ادیب اور انشاء پرداز بھی اس طرف متوجہ ہوئے۔ مگر انہوں نے اسٹیج سے قطع نظر کر کے ڈرامہ کو محض ایک صنف کے طور پر برتا جو کتابوں تک محدود رہا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے دیگر کارناموں کے علاوہ ایک ڈرامہ 'اکبر' بھی شروع کیا تھا جس کی وہ تکمیل نہ کر سکے۔ بعد میں اسے ناصر نذیر فراق نے مکمل کیا۔ اس میں زبان کی دلکشی کے علاوہ اور کوئی بات قابل توجہ نہیں۔ مرزا محمد ہادی رسوا اپنے دور کے ڈراموں کی مبتذل کیفیت اور غیر معیاری بلکہ غلط زبان سے برہم تھے۔ زبان و بیان اور پاکیزگی خیال کا مرقع پیش کرنے کے لیے انہوں نے منظوم ڈرامہ مرقع "لسلی" "مجنون" لکھا۔ اس میں نظم کی تمام مروجہ بحروں کا استعمال کر کے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو متعارف کرایا۔

بڑھتے ہوئے سیاسی شعور اور معاشرتی زندگی کے پیچ در پیچ مسائل کے نتیجے میں ڈرامے کی مقصدیت کی طرف توجہ دی گئی۔ جنگ روس و جاپان میں ظفر علی خان نے دونوں ملکوں کی جنگ اور جاپانیوں کی حب الوطنی دکھا کر ہندوستانیوں کو وطن پرستی کی ترغیب دی۔ "زود پشیمان" مولانا عبد الماجد دریابادی کا معاشرتی ڈرامہ ہے جس میں بچپن کی شادی کی مذمت کی گئی ہے۔ پنڈت کیفی نے "راج دُ لاری" لکھ کر بچوں کی تعلیم و تربیت پر خاص طور زور دیا ہے۔ عبد الحلیم شرر، پریم چند، چکبست نے بھی بعض ڈرامے لکھے مگر ڈرامے کی حیثیت سے وہ بھی قابل قدر نہیں۔

سید امتیاز علی تاج اور سید عابد حسین اردو کے وہ بلند پایہ ادیب ہیں جنہوں نے

اردو ڈرامہ نگاری کو نئی اور فکر کی گہرائی اور لطافت سے روشناس کرایا کم و بیش ایک

ہی زمانہ میں تاج نے ”انارکلی“ اور عابد حسین نے ”پردہ غفلت“ رام کے ڈرامے لکھے۔ ان میں ڈرامہ کے جدید مغربی معیاروں کو نمونہ بنایا۔

ڈرامے کا زوال

بیسویں صدی کا پہلا چوتھائی حصہ گزرنے کے ساتھ ہی ڈرامے کا زوال ہو گیا۔ ریڈیو اور فلم نے عوام و خواص کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ ایک عالمی سانحہ ہے اور صرف ہندوستان تک محدود نہیں۔

ریڈیائی ڈرامے کے تقاضے مختلف ہیں۔ یہاں کچھ نظر نہیں آتا صرف آواز کے تاثر سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ تصور اتنا بھرپور اور ایسا کارگر ہوتا ہے کہ ریڈیو سننے والا چشم تصور سے سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔ ریڈیو کے بعد فلم نے تھیٹر کی جگہ لی۔ اب ٹیلی ویژن کا رواج ہے اور تقریباً ہر گھر تک اس کی رسائی ہے۔ ٹیلی ویژن کو فلم ہی کہنا چاہیے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فلم دیکھنے کے لیے آپ کسی ہال میں جاتے ہیں۔ اب ٹی وی کے ذریعے فلم آپ کے گھر آ جاتی ہے۔ ان وسائل نے تھیٹر اور ڈراما کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ لیکن یہ سب مانتے ہیں کہ تھیٹر ایک فن ہے اور اسے پنپنے کا موقع ملنا چاہیے۔ آزادی سے پہلے بھی اس طرف توجہ کی جا رہی تھی۔ آزادی کے بعد اس توجہ میں اضافہ ہو گیا۔ ملک کی یونیورسٹیاں اس فن کو فروغ دینے کے لیے مسلسل کوشش کر رہی ہیں۔ بیگم قدسیہ زیدی اور حبیب تنویر نے اس میدان میں قابل قدر کام کیا ہے۔ ان کی کوشش سے دہلی میں ہندوستانی تھیٹر کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا جس نے ”سہراب اور رستم“، ”مٹی کی گاڑی“، ”شکنتلا“، ”خالد کی خالہ“، ”گڑیا گھر“، ”مدراراکشس“ وغیرہ ڈرامے پیش کئے۔

حکومت ہند نے ۱۹۵۳ء میں سنگیت نائک اکاڈمی کے نام سے ایک مرکزی

ادارہ قائم کیا۔ اس کے مقاصد میں نائک کو فروغ دینا بھی شامل ہے۔ یہ کام اس کی شاخ ”نیشنل سکول آف ڈراما“ انجام دیتی ہے۔ ملک کے تمام حصوں میں اس قسم کی کوششیں جاری ہیں۔ یہ سب درست مگر فلم اور ٹی وی کے ہوتے ہوئے تھیٹر کا فروغ مشکل نظر آتا ہے۔

ڈراما کی تدریس

چونکہ تعلیم زبان میں زبان کا حقیقی علم ڈراما سے ہی ہوتا ہے۔ اس لیے ڈراما کی اہمیت اور افادیت مندرجہ ذیل باتوں سے واضح ہو جاتی ہے۔

فوائد

۱۔ جب بچہ پڑھی ہوئی کہانی یا سبق کو ڈراما کی شکل میں دیکھتا ہے یا سنتا ہے تو وہ بہت سے الفاظ اور جملوں کا مطلب اُستاد کے سمجھانے کے بغیر خود بخود سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ جذباتی افعال مثلاً سہنے، خوش ہونے، غصہ ہونے، جھڑکنے، ڈانٹنے، روٹھ جانے اور ناک بھوں چڑھانے وغیرہ کے مفہوم اور نتیجے کا صحیح احساس ڈراما ہی کے ذریعے جلد ہو جاتا ہے۔

۲۔ استاد کے لیے ڈراما کے ذریعے یہ جاننا آسان بن جاتا ہے کہ لڑکا پڑھے ہوئے سبق کو اچھی طرح سمجھ چکا ہے یا نہیں۔

۳۔ ڈراما کے ذریعے تعلیم کے بنیادی اصول ”کام بڑا معلم ہے“ کے مطابق بچوں کو خود کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ انہیں اپنے خیالات ظاہر کرنے اور آزادانہ طور پر بولنے کی مشق ملتی ہے۔ اس قسم کی متواتر مشقوں سے وہ حاضر جواب بن جاتے ہیں اور ان کی بے جا شرم اور جھجک ہٹ جاتی ہے۔ ان کے

مقررانہ جو ہر کھل جاتے ہیں اور وہ اپنے اندر ایک وجدانی مسرت۔ اور خود اعتمادی پا کر اپنی شخصیت کی نمود کے قابل بن جاتے ہیں۔

۴۔ ڈراما کرانے سے بچوں کے درکات میں پختگی اور تصورات میں استقلال پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے خاموش جذبات میں حرکت اور زندگی میں شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے خیالات میں نکھار اور انداز بیان میں جوش اور ابھار آ جاتا ہے۔ وہ حروف و الفاظ اور عبارت کو اپنی بر محل حرکات و اشارات کے ساتھ ہم آہنگ کرنا سیکھ جاتے ہیں اور آئندہ زندگی کے مختلف اور کارآمد کاموں کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

۵۔ بچے جبلی طور پر چلبے، حرکی اور چنچل ہوا کرتے ہیں۔ ڈراما سے ان کی یہ جبلت تصعید ہو کر تعمیری کاموں میں لگ جاتی ہے۔ اگر ڈرامے معقول طریقے سے کرائے جائیں تو بچوں میں ایثار، خود اعتمادی، خودداری، فرض شناسی، خوش خلقی اور رحم دلی کی صفات پیدا کی جاسکتی ہیں اور ان ہی صفات کی وجہ سے بچوں میں اعلیٰ سیرت تعمیر کی جاسکتی ہے۔

۶۔ ڈرامے سے بچے بوجھل سے بوجھل کام کو ہلکا اور بے لطف سے بے لطف کام کو دلچسپ محسوس کر پاتے ہیں۔ درج بالا فوائد کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بچوں کی تعلیمی دلچسپی کو ابھارنے، ان کی طبائع میں تعلیم کے لیے مستعدی پیدا کرنے، انہیں فضائے مدرسہ سے پوری طرح مانوس کرنے اور انہیں عملی زندگی سے دن بدن قریب تر کرنے کے لیے تعلیم زبان میں ڈراما کو ایک خاص مقام مل جانا چاہیے۔

ڈراما کرانے کے لیے ہدایت

ڈراما سٹیج کرانے اور بچوں کو آسانی کے ساتھ اس سے خوگر کرنے کے سلسلے میں اُستاد کو ذیل کی باتوں پر عمل کرنا چاہیے:

- ۱۔ سبق کا اعادہ بچوں سے سوال و جواب کی صورت میں کرایا جائے
- ۲۔ ڈراما کے مختلف حصوں کو بانٹتے وقت خیال رکھا جائے کہ مقررانہ صلاحیت رکھنے والے کسی ایسے ذہین لڑکے کو کہانی کا ہیرو بنادیا جائے جس کی بہترین پیشکش سے باقی لڑکوں میں رشک کا مادہ پیدا ہو جائے اور ڈراما کی ایک قابل تقلید مثال قائم ہو جائے۔

۳۔ کوئی ڈراما سٹیج کرانے کے بعد بچوں میں ایک دوسرے کے پارٹ تبدیل کر کے بانٹ دئے جائیں اور اچھے پارٹ ادا کرنے والے بچوں کے لیے انعامات مقرر کئے جائیں۔

۴۔ سال بھر میں کم سے کم دو بار یوم والدین کی تقریبوں پر عوام اور بچوں کے سرپرستوں کے اجتماع میں بچوں سے ڈرامے سٹیج کرائے جائیں تاکہ عوام کو اُستاد کے کام اور اپنے بچوں کی ذہنی یا علمی ترقی کا صحیح اندازہ کرنے کا موقع ملے۔ اور اُستاد ڈراموں کے ذریعے سماجی اصلاح کا بیڑا اٹھائے اور طلباء اور عوام کے سامنے ملک کی بہبودی اور تعمیر و ترقی کی راہیں کھول دے اور مجموعی بہبود کے لیے یکجہتی پیدا ہو جائے۔

آخر پر یہ بتانا ضروری ہے کہ وہی اُستاد اپنے شاگردوں میں ڈراما کی اعلیٰ خصوصیات پیدا کر سکتا ہے جو خود ایک اچھے ہدایت کار کی صفات اپنے اندر رکھتا ہو۔

نشر اور اس کی قسمیں

نثر کی کوئی قطعی تعریف بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ ہر وہ کلام جو نظم نہیں ہے نثر کے دائرے میں آتا ہے۔ موٹے طور پر ہم نثر کی بنیاد دو خصوصیات پر رکھ سکتے ہیں۔

- ۱۔ وہ کلام جس میں کسی مخصوص نظام کے تحت وزن نہ ہو نثر کہلاتا ہے۔
- ۲۔ اس کے جملوں اور فقروں کی بناوٹ اور ترتیب قواعد کے مقررہ اصولوں کے مطابق ہو۔ نثر کی قسموں کو ہم لفظی اور معنوی اقسام کے تحت رکھ سکتے ہیں۔

لفظی قسمیں

(۱) مسجع (۲) مرجز (۳) عاری

معنوی قسمیں

(۱) دقیق، رنگین، دقیق سادہ (۲) سلیس رنگین، سلیس سادہ

عام طور معنوی قسمیں صرف دو ہیں۔

دقیق اور سلیس

دقیق نثر رنگین بھی ہوتا ہے اور سادہ بھی

اسی طرح سلیس نثر رنگین بھی ہوتا ہے اور سادہ بھی

لفظی اقسام

نثر مسجع: ایسی نثر جس کے دو فقروں کے تمام الفاظ ایک دوسرے کے ہم وزن ہوں نثر مسجع کہلاتی ہے۔ ”دریائے لطافت“ میں سید انشاء نے اس کی مثال میں یہ فقرے لکھے ہیں۔

پونڈا میٹھا اتنا بھلا کہ جس کی بھلائی گمان سے بڑھ کر ہے۔ پونڈا پھیکا اتنا بُرا کہ اس کی برائی بیان سے باہر ہے۔

ان دونوں جملوں میں تمام الفاظ ہم وزن ہیں۔

پونڈا، پونڈا	میٹھا، پھیکا	اتنا، اتنا	بھلا، بُرا
بھلائی، بُرائی	گمان، بیان	بڑھ کر ہے	باہر ہے۔

مرصع

عبارت میں ایسے الفاظ یا فقرے لانا جو وزن اور حرکت میں یکساں ہوں مثلاً سیرت کی بھلائی بیان سے باہر تو صورت کی صفائی گمان سے بڑھ کر ہے۔ سیرت میں سنجیدگی تو صورت میں پسندیدگی، فطرت ارجمند تو صورت دل پسند۔
نوٹ: مسجع کی ایک شکل مقفیٰ نثر کی صورت میں بھی نظر آتی ہے۔
اوپر کی مثال میں وزن اور حرکت کی وضاحت اس طرح ہے۔

سیرت، صورت، بھلائی، صفائی، بیان، گمان، سنجیدگی، پسندیدگی، ارجمند، دل پسند

نثر مقفیٰ

ایسی نثر جس کے فقروں میں وزن نہ ہو، لیکن قافیہ استعمال کیا گیا ہو، غالب

کے خطوط میں اس کی بہترین مثالیں مل جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر غالب کے درج ذیل اقتباس میں خط کشیدہ الفاظ ہم قافیہ ہیں۔

”حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکالا۔ بوستانِ خیال کے دیکھنے کا دانہ ڈالا مجھ میں اتنی طاقت پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں۔ دام پر گر کے داہ زمین پر سے اٹھاؤں“۔

نثر مرجز

وہ نثر جس میں وزن ہو مگر قافیہ کا اہتمام نہ ہو۔ نثر مرجز کہلاتی ہے۔ نثر کے تمام فقروں میں وزن پیدا کرنے کے لیے الفاظ کی ترتیب میں الٹ پھیر کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً

تمامتِ موزون کے روبرو سُر و واں ناچیز ہے اور
کاگلِ پیچان کے سامنے مشکِ ختن بے قدر ہے

نثر عاری

نثر عاری وہ نثر ہے جس میں نہ مسجع کی طرح ہر فقرے کے آخر میں قافیہ ہو اور مرجز کی طرح دو فقروں کے کلمات ہم وزن ہوں لیکن سنجیدگی، متانت، سلاست اور فصاحت میں بلند درجہ رکھتی ہو۔ مثلاً ”تاریخ کے اوراق پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ یہ عجائب زار ہمیشہ سے عجیب عجیب تغیرات و حوادث کی آماجگاہ رہ چکا ہے۔ قوموں اور ملکوں کا عروج و زوال، عظیم الشان سلطنتوں کی تباہی و بربادی، نیرنگِ روزگار کے ادنیٰ کرشمے اور نمونے ہیں۔“

معنوی قسمیں

دقیق رنگین و سادہ

دقیق وہ نثر ہے جس میں نامانوس اور غیر مروجہ الفاظ یعنی وہ الفاظ جو سمجھ سے باہر ہوں استعمال کئے گئے ہوں۔ آسانی سے سمجھ میں نہ آنے والی تشبیہات اور استعارات دقیق نثر کی پہچان ہے۔

”طاؤس آمادہ رقص ناز ہے یازمین کے رخسار پر سبزہ آغاز ہے۔ کوہ و صحرا میں سُنبل دریا حسین، لالہ و نسرین کی نشوونما ہے، دامنِ دشتِ جبال اس سالِ سبد گلچین ہو گیا۔ پھولوں سے بھرا ہوا ہے۔ گل رعنا زیبائی سے شگفتہ ہو کے سراپا گوش ہے۔ بلبلِ شیدا پھولا نہیں سماتا۔ چمک رہا ہے۔ اس اقتباس میں رنگین و سادہ نثر دقیق کی ترجمانی ہے۔

سلیس رنگین و سلیس سادہ

سلیس وہ نثر ہے جو دقیق کی ضد ہو۔ یعنی اس میں ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جن کا رواج عام ہو اور جو آسانی سے سمجھ میں آ سکتے ہوں۔ سلیس نثر میں تشبیہات و استعارات بھی آسانی سے سمجھ میں آ جاتے ہیں۔

”پچھلے برس کی آخر رات کو ایک بوڑھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی اندھیری اور ڈراؤنی ہے، گھٹا چھارہ ہی ہے، بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے۔ آندھی بہت زور سے چل رہی ہے جس سے دل کانپ اٹھتا ہے۔“

حروف شمسی و حروف قمری

عربی میں کسی اسم میں تخصیص پیدا کرنے کے لیے اُس پر ”ال“ زیادہ کر دیتے ہیں۔ عربی حروف تہجی میں سے بعض حروف ایسے ہیں کہ اگر اُن سے پہلے ”ال“ آئے تو ”ل“ کی آواز ظاہر نہیں ہوتی۔ ایسے حروف کو ”حروف شمسی“ کہتے ہیں۔ ذیل کے چودہ حروف ”حروف شمسی“ ہیں۔

۱۔ ت۔ مثلاً: التَّقْوِيم۔ فارغ التَّحْصِيل

۲۔ ث۔ مثلاً: ربيع الثَّاني۔ الثُّبَات

۳۔ د۔ مثلاً: زين الدين، الدنيا

۴۔ ذ۔ مثلاً: بَرِي الذَّمِّه۔ افضل الذِّكْر

۵۔ ر۔ مثلاً: عبد الرَّحْمٰن۔ عبد الرَّحِيم

۶۔ ز۔ مثلاً: بديع الزَّمان۔ سريع الزَّوال

۷۔ س۔ مثلاً: السَّلام عليكم۔ عبد السَّلام

۸۔ ش۔ مثلاً: وَالشَّمْس۔ دار الشِّفَا

۹۔ ص۔ مثلاً: عَلَى الصُّبْح۔ الصَّلَاة

۱۰۔ ض۔ مثلاً: عِنْد الصَّرُورَة۔ الضِّيَا

۱۱۔ ط۔ مثلاً: وَالطَّارِق۔ الطَّاهِر

- ۱۲۔ ظ۔ مثلاً: مِنَ الظَّالِمَاتِ. الظَّالِم
- ۱۳۔ ل۔ مثلاً: مَاءَ اللَّحْمِ. علم اللسان
- ۱۴۔ ن۔ مثلاً: إِلَى النَّوْرِ. النصیحت

حرف قمری

جن حروف کے پہلے ”ال“ ”آ“ ”کر“ ”ل“ پڑھا جائے وہ حروف ”حروف قمری“

کہلاتے ہیں۔ یہ بھی مندرجہ ذیل چودہ حروف ہیں۔

- ۱۔ ل۔ مثلاً: امیر الامراء۔ مابہ الامتیاز
- ۲۔ ب۔ مثلاً: عبد الباری۔ فارغ البال
- ۳۔ ج۔ مثلاً: عبد الجبار۔ صاحب الجمال
- ۴۔ ح۔ مثلاً: فی الحقیقت۔ الحمد
- ۵۔ خ۔ مثلاً: دار الخلافۃ۔ داعی الخیر
- ۶۔ ع۔ مثلاً: دار العلوم۔ عبد العلی
- ۷۔ غ۔ مثلاً: عبد الغنی۔ صاحب الغرض
- ۸۔ ف۔ مثلاً: ابو الفضل۔ عید الفطر
- ۹۔ ق۔ مثلاً: عبد القادر۔ خادم القوم
- ۱۰۔ ک۔ مثلاً: بالکل۔ علم الکلام
- ۱۱۔ م۔ مثلاً: المومن۔ بیت المکرم
- ۱۲۔ و۔ مثلاً: حب الوطن۔ صاحب الوضع
- ۱۳۔ ہ۔ مثلاً: بوالہوس۔ امام الہند

حروف شمسی اور حروف قمری کی شناخت یہ ہے کہ

”ال“ کے بعد جو حروف مشدّد ہوگا وہ حروف شمسی اور جو غیر مشدّد ہوگا وہ حروف قمری ہوگا۔ جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے واضح ہے۔

اہل قواعد نے حروف شمسی اور حروف قمری کی ایک اور شناخت یہ بیان کی ہے کہ جن حروف پر ”ال“ داخل ہو اور وہاں ”ل“ پڑھنے میں نہ آئے تو ”ل“ کے فوراً بعد والا حرف، حرف شمسی ہوگا نہیں تو حرف قمری۔

حروف تہجی کے ان دو بڑے مجموعوں کو حروف شمسی اور حروف قمری کہنے کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ لفظ ”الشّمس“ میں ”ل“ خاموش ہے اس لیے اس کے بعد والے حرف ”ش“ کی قسم کے تمام حروف جن میں ”ل“ خاموش رہتا ہے حروف شمسی کہلائے، اس کے برعکس لفظ ”القمر“ میں ”ل“ تلفظ آتا ہے۔ اس لیے ”ل“ کے بعد والے ”ق“ کی قسم کے تمام حروف، حروف قمری کہلائے۔

**(Standard Sounds of Urdu Vowels,
ascents, Improvement in
pronunciation)**

تلفظ تدریس زبان کا ایک اہم پہلو ہے۔ تلفظ کے بغیر صحیح زبان کا سیکھنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ تلفظ کی تدریس میں علم صوتیات کافی حد تک مدد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

علم صوتیات اُس علم کو کہتے ہیں جو آوازوں کے مخرج اور اُن کی ادائیگی سے بحث کرتا ہے۔ یعنی علم صوتیات یہ بتاتا ہے کہ جو آوازیں ہم بولتے ہیں وہ کس طرح کی ہیں اور کہاں سے نکلتی ہیں اور علم صوتیات آوازوں کا تجزیہ، توضیح اور درجہ بندی بھی کرتا ہے۔ صوتیات کی تین شاخیں ہیں:

(۱) تلفظی صوتیات (۲) سمعیاتی صوتیات (۳) سمعی صوتیات

(۱) تلفظی صوتیات: صوتیات کی یہ شاخ انسانی اعضائے تکلم سے پیدا ہونے والی مختلف آوازوں کا مطالعہ کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ یہ آوازیں کس طرح اور کہاں سے نکلتی ہیں۔

(۲) سمعیاتی صوتیات: صوتیات کی یہ شاخ نہ واضح کرتی ہے کہ کلام میں

تک پہنچتی ہیں۔

(۳) سمعی صوتیات: سمعی صوتیات میں اس امر کا مطالعہ کیا جاتا ہے کہ مخاطب اپنے اعضاءِ سماع کے ذریعے کس طرح آوازوں کو موصول کرتا ہے۔

تدریس تلفظ کے نقطہ نظر سے مذکورہ بالا تینوں شاخوں میں تلفظی صوتیات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کی پہلی منزل اعضاءِ تکلم ہے۔

اعضائے تکلم: اعضاءِ تکلم سے مراد وہ اعضاء ہیں جو آوازوں کی ادائیگی میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور تکلم ایک ثانوی اور اتفاقی عمل ہے جو اس وقت سرزد ہوتا ہے جب پھیپھڑوں کے اندر اور باہر آنے جانے والی ہوا کی روانی میں حشرہ، حلق اور دہنی جوف کے کسی نقطے پر رکاوٹ واقع ہو یعنی تلفظ کا رخارج سے چٹ کر یا ان کے قریب پہنچ کر راستے کو مکمل طور پر بند کر دیتے ہیں جس سے مختلف آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ اعضاءِ تکلم میں بعض اعضاء متحرک ہوتے ہیں اور بعض غیر متحرک۔ متحرک اعضاء کو تلفظ کار (articulators) کہا جاتا ہے جیسے زبان، غشاء وغیرہ۔ غیر متحرک اعضاء مخارج (point of articulation) کہلاتے ہیں مثلاً دنداں، لٹہ، حنک وغیرہ۔ تلفظ کے اعتبار سے تمام اعضاءِ تکلم میں زبان سب سے زیادہ اہم عضو ہے۔ بے شمار مصمتوں کی ادائیگی میں زبان کا اہم رول ہے۔

مسوڑھے: مسوڑھوں کو لٹہ بھی کہتے ہیں۔ ان کی مدد سے بھی بہت سی اصوات ادا کی جاتی ہیں۔

حنک: یہ غیر متحرک ہے۔ اس کی مدد سے ہم شکل اصوات ادا کی جاتی ہیں۔

غشاء: یہ عضلاتی اور متحرک حصہ ہے۔ اس کی مدد سے بہت سی اصوات مثلاً

ک، گ، خ، وغیرہ نکالی جاتی ہیں۔

حلقوم: کچھ اصوات اس جوف میں پیدا ہوتی ہیں جنہیں حلقوی اصوات کہا

جاتا ہے مثلاً ع، غ وغیرہ۔

حجرہ: یہ سانس کی نالی کے اوپر ایک لچکدار بندھنوں کی ساخت ہے۔ حجرہ کے اندر صوت تانت ہوتے ہیں۔ صوت تانت ہوائی گزر گاہ ان کو قریب لا کر ہوا گزاری جائے تو ان میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اصوات جو صوت تانتوں کے ارتعاش کے ساتھ نکلتی ہیں۔ مسموع (voiced) کہلاتی ہیں اور وہ اصوات جن کے نکالنے میں صوت تانتوں کا ارتعاش نہیں ہوتا ہے وہ غیر مسموع (voiceless) کہلاتی ہیں۔

اردو اصوات کی گروہ بندی

اردو اصوات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) مصوتے (Vowels) (۲) مصمتے (Consonants)

مصوتے ان کو حرف علت بھی کہتے ہیں۔ اردو زبان میں تین حروف جو خالص حروف علت ہیں، ا، و، ی، اردو زبان میں تینوں حروف ہر لحاظ سے استعمال ہوتے ہیں اگر کسی لفظ میں ان تینوں حروف میں سے کوئی بھی حرف موجود نہ ہو تو زیر، زیر اور پیش سے کام لیا جاتا ہے ان کو مختصر حروف علت کہتے ہیں۔ چنانچہ اردو میں یہ مختصر حروف علت ہندی سے لئے گئے ہیں جیسے:

مثلاً: ا آ ا ای اؤ اے اے او ام آہ
ان کے بغیر زبان بولنا اور لکھنا ناممکن ہے اس لیے متذکرہ خالص حروف علت کے علاوہ درج بالا مختصر حروف علت زبان میں شامل ہیں۔ اور باقی حروف، حروف صحیح میں شمار کئے جاتے ہیں۔

ہونے والی ہوا بغیر کسی رکاوٹ کے منہ کے راستے باہر نکلتی ہے جیسے آ، ا (a) انگریزی زبان میں پانچ واویل ہیں۔ (a, e, i, o u) وغیرہ۔

مصوتے: مصوتے وہ ہیں جن کی ادائیگی میں ہوا بغیر کسی رکاوٹ کے منہ کے راستے باہر نکلتی ہو چونکہ مصوتوں کے تلفظ میں عام طور پر صوت تانت ارتعاش کرتے ہیں اس لیے تمام مصوتے مسموع ہوتے ہیں۔

مصمتے: (Consonants) وہ اصوات ہیں جن کی ادائیگی میں پھپھڑوں سے خارج ہونے والی ہوا حلق، حلقوم یا منہ کے راستے میں کہیں نہ کہیں پوری یا جزوی طور پر رُک کر باہر نکلتی ہے جیسے ا، ب، پ، ت، ط، ع، غ وغیرہ غرض کہ ہر حرف بغیر حرف علت کے مصمتے یا حروف صحیح (Consonants) کہلاتے ہیں جن کا تلفظ مصوتوں کے اُلٹ میں ہے۔

سیلبس تدریس اُردو برائے بی۔ ایڈ کلاس کشمیر یونیورسٹی

Unit-I باب اول

(i) Position of Urdu Language

اُردو زبان کا منصب

(ii) Origin and development of Urdu Language

اُردو زبان کا آغاز و ارتقاء

(iii) Objectives of Teaching Urdu at elementary and secondary levels

ابتدائی اور ثانوی سطحوں پر اُردو پڑھانے کے اغراض و مقاصد

(iv) Problems of Urdu Teaching

تدریس اُردو کے مسائل یا مشکلات

باب دوم: طریقہ ہارئے کار

Unit-II Methods

(i) Translation Method

(ii) Direct Method

براہ راست طریقہ

(iii) Playway Method

کھیل کھیل طریقہ

(iv) Structural Approach

ساختی یا بناوٹی طرز نظر

(v) Communication Approach

ترسیلی یا ابلاغی طرز نظر

(vi) Bilingual Method

ذولسانی یا دوزبانی طریقہ

Unit-III باب سوم: لکھنا اور پڑھنا

(i) Reading and Writing

لکھنا اور پڑھنا

(ii) Importance, Concept and Meaning

اہمیت، تصور اور معنی

(iii) Types of Reading: (i) Intensive (ii) Extensive (iii) Loud

(iv) Silent

پڑھائی یا مطالعہ کے اقسام

(۱) گہرا یا عمیق یا غائر یا وسیع مطالعہ (۲) سرسری یا سطحی یا طائرانہ مطالعہ (۳) مطالعہ

بالجہر بلند خوانی (۴) خاموش خوانی یا خاموش مطالعہ یا زیر لب مطالعہ یا حیطہ مطالعہ

(iii) Comprehensive reading defects and their cure

قابل فہم مطالعہ، کوتاہی اور اس کا تدارک

(iv) Elementary knowledge of Urdu Scripts

اُردو رسم الخط کی بنیادی جانکاری

(i) Khate Naskh (ii) Khate Nastaleeq (iii) Khate Shikasta

(۱) خط نسخ (۲) خط نستعلیق (۳) خط شکستہ

(vi) Teaching of Alphabets borrowed from Arabic, Persian and Hindi, their shapes and new cultivate

عربی، فارسی اور ہندی زبانوں سے مستعار لئے گئے حروف، ان کی نئی ترتیب ترقی اور تدریس

(vii) Quality of a good Handwriting

اچھی خوشخطی کی خوبی یا اچھی لکھائی کے اوصاف

(vii) Defects in writing skills and their improvement

لکھنے کی ہنر میں خامیاں اور ان کی بہترین کے لیے اصلاح

(ix) Essay Writing

مضمون نویسی

باب چہارم: تدریس نشر و نظم

Unit IV- Teaching of Prose and Poetry

(i) Teaching of prose and lesson planning

تدریس نشر اور منصوبہ درس

(ii) Teaching of poetry and lesson planning

تدریس نظم اور منصوبہ درس

(iii) Concept and Meaning of Evaluation

اندازہ قدر / پیمائش قدر / جانچ / پرکھ کا تصور اور معنی

(iv) Criteria of good language test

اچھی زبان فہمی آزمائش کا معیار

(v) Error analysis and remedial Teaching

خطا تجزیہ اور اصلاحی تدریس

(vi) Types of Language Test

زبان فہمی آزمائش کی قسمیں

Unit-V

باب پنجم: مشمولات

Content

(i) A brief history of Aligarh Movement and Progressive Movement

علی گڑھ تحریک یا سرسید تحریک اور ترقی پسند تحریک کی مختصر تاریخ

(ii) Main School: Dabistans of Lucknow and Delhi

دبستان لکھنؤ اور دبستان دہلی

(ii) Various forms of Urdu Literature

اردو ادب کی مختلف اصناف ادب

(i) Prose (ii) Dastan (iii) Novel (iv) Afsana (v) Drama (vi)

Insha

(۱) نثر (۲) داستان (۳) ناول (۴) افسانہ (۵) ڈراما (۶) انشائیہ

(iv) Standard sounds of Urdu vowels, consonants, Haroofi Shamshi, Haroofi Qamri, Stress, Intonation and Improvement in Pronunciation

اردو کی معیاری آوازیں اور ان کا تلفظ: وصمت، مصمت، حروف شمسی، حروف قمری، بل اور سر، اردو تلفظ کو بہترین بنانے کی اصلاح

کتابیات اُردو

- ۱۔ تاریخ ادب اُردو: پروفیسر نور الحسن نقوی
- ۲۔ تعلیم زبان اُردو: تنہا انصاری
- ۳۔ تدریس اردو: محی الدین قادر زور
- ۴۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو: پروفیسر مسعود حسین خان
- ۵۔ اردو ادب کی تاریخ: عظیم الحق جنیدی
- ۶۔ اُردو زبان کی تدریس: معین الدین
- ۷۔ فن تدریس اردو: ع۔ ع۔ عارف۔
- ۸۔ اُردو کیسے پڑھائیں: سلیم عبداللہ
- ۹۔ طریقہ تعلیمات اُردو (تدریس اُردو): ڈاکٹر عبدالحق، پروفیسر قاسم قریش
- ۱۰۔ دکن میں اردو: نصیر الدین ہاشمی
- ۱۱۔ آب حیات: محمد حسین آزاد
- ۱۲۔ رہنمائے معلمین اردو: ڈاکٹر دیوندر گپتا
- ۱۳۔ پنجاب میں اُردو: پروفیسر محمود شیرانی

۱۴۔ باغ و بہار: میرامن

۱۵۔ نقوشِ سلیمانی: مولانا سید سلیمان ندوی

۱۶۔ درخشان ستارے: ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان

۱۷۔ اصول تدریس: محمد قاسم صدیقی (سابق ریڈر شعبہ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

۱۸۔ ثانوی تعلیم اور اس کے مسائل: محمد قاسم صدیقی سابق پرنسپل 10+2 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

Question Papers for B.Ed

Teaching of Urdu Paper V Old, Paper VI New

بی۔ ایڈ کلاس کے لیے پچھلے چند سالوں کے تدریس
اردو کے کچھ سوالنامے

Examination B.Ed.

Course No./ Paper : Teaching of Urdu

Paper : V (old) Paper: VI (New)

Maximum Marks: 80

Minumu Pass Marks: 32

Time Allowed: 3 hours

(New and Old Course)

نوٹ: پانچ سوالوں کے جواب لکھئے۔ سوالوں کے نمبر مساوی ہیں۔

۱۔ اردو زبان کے مختلف نظریات سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے۔

تدریس زبان کے مقاصد بیان کیجئے

۲۔ ترجمے کے طریقے کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیجئے۔

یا

براہ راست طریقہ ایک کارآمد طریقہ ہے۔ تفصیل سے لکھئے۔

۳۔ تدریس زبان میں بلند خوانی اور خاموش خوانی کیوں ضروری ہے۔ وضاحت کیجئے۔

یا

خوش خطی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔ بیان کیجئے۔

۴۔ اردو نثر کا تدریسی خاکہ پیش کیجئے۔

یا

تدریس زبان میں جانچ کے مقاصد لکھئے۔

۵۔ داستان اور ناول میں فرق بیان کیجئے۔

یا

سرسید تحریک ایک ادبی تحریک ہے۔ واضح کیجئے۔

Course No./ Paper : Teaching of Urdu Paper :

V Maximum Marks: 80 Minumu Pass

Marks: 32 Time Allowed: 3 hours

نوٹ: پانچ سوالوں کے جواب لکھئے۔ سوالوں کے نمبر مساوی ہیں۔

۱۔ اردو زبان کے آغاز سے متعلق اہم نظریات کا جائزہ لیجئے۔

یا

انگریزی میڈیم اسکولوں میں اردو زبان کی تدریس کے مسائل سے بحث کیجئے۔

۲۔ تدریس کے روایتی اور جدید طریقوں سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے اور ان کے درمیان بنیادی فرق کی نشاندہی کیجئے۔

یا

کھیل کھیل میں پڑھانے کے طریقہ تدریس (Play way Method) یا ذولسانی طریقہ تدریس (Bi Lingual Method) سے متعلق بحث کیجئے۔

۳۔ مضمون نگاری کے متعلق مختلف اقسام اور لکھنے کے طریقوں سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے۔

یا

اردو رسم الخط کی منفرد خصوصیات بیان کیجئے اور خط نسخ اور خط نستعلیق کے درمیان فرق

۴۔ نثر کی تدریس کے دوران کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے؟ کسی نثری سبق کو پڑھانے کے لیے درسی خاکہ (Lesson Plan) تیار کیجئے۔

یا

جانچ کی اہمیت اور اس کے طریقہ ہائے کار پر روشنی ڈالئے۔
۵۔ علی گڑھ تحریک کی ادبی خدمات کا مفصل جائزہ لیجئے۔

یا

دلی اور لکھنؤ کے شعری دبستانوں کی منفرد خصوصیات کی نشاندہی کیجئے۔

Course No./ Paper : Teaching of Urdu Paper :

V Maximum Marks: 80 Minumu Pass

Marks: 32 Time Allowed: 3 hours

نوٹ: تمام سوالوں کے جواب لکھئے۔ سوالوں کے نمبر مساوی ہیں۔

۱۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقاء پر اظہار خیال کیجئے۔

یا

۲۔ کشمیر میں اردو تدریس کے اہم مسائل کیا ہیں؟
تدریس زبان سے متعلق اہم طریقوں کا جائزہ پیش کیجئے۔

یا

۳۔ گرامر ٹرانسلیشن طریقہ تدریس کے اہم نکات پر تبصرہ کیجئے۔
خاموش خوانی اور بلند خوانی کی خوبیوں اور خامیوں کی وضاحت کیجئے۔

یا

۴۔ خط نستعلیق کے بارے میں اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے۔ نیز یہ بتائے کہ اردو
زبان کے لیے طرز تحریر کس حد تک مفید ہے۔
۴۔ مضمون نویسی کے اہم تقاضے کیا ہیں۔ تفصیل سے بیان کیجئے۔

یا

۵۔ اردو زبان و ادب کی ترقی میں علی گڑھ تحریک کی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

یا

Course No./ Paper : Teaching of Urdu Paper : V

Maximum Marks: 80 Minumu Pass Marks: 32

Time Allowed: 3 hours

نوٹ: تمام سوالوں کے جواب لکھئے۔ سوالوں کے نمبر مساوی ہیں۔

۱۔ اردو زبان کے آغاز سے متعلق چند اہم نظریات کا جائزہ لیجئے۔

یا

پرائمری اور ثانوی سطح پر اردو تدریس کے مقاصد کی وضاحت کیجئے۔

۲۔ تدریس زبان کے روایتی طریقوں کی خوبیاں اور خامیوں کا جائزہ لیجئے۔

یا

تدریس زبان کے جدید طریقوں سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے۔

۳۔ اردو رسم الخط کی تدریس میں کن اہم باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے؟

یا

اردو میں خوش نویسی کی کیا اہمیت ہے اور اس کی تدریس میں کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے؟

یا

۴) ایک بہتر جانچ کی کیا پہچان ہے؟ تدریس زبان میں طریقہ جانچ کی کیا اہمیت ہے؟

۵۔ اردو ناول یا اردو افسانہ کے ارتقاء پر بحث کیجئے۔

یا

علم صوتیات سے کیا مراد ہے؟ اردو زبان کی تدریس میں صوتیات سے کیا مدد لی جاسکتی ہے؟

G.M. College of Education

■ ■ ■ Raipur, Bantalab

Jammu.

1

11

Gandhi Memorial College Of Education Bantalab Jammu

”اس کتاب کے مرتبین نے حتی الوسع کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں ہر وہ ضروری مواد شامل کیا جائے جو تدریس اُردو کے سلسلے میں لازمی ہے۔ نہ صرف تھیوری کی وضاحت ہو بلکہ لیسن پلان، نمونہ درس، تدریس خرد وغیرہ حصوں کو شرح و بسط کے ساتھ سادہ، سلیس اور عام فہم زبان میں پیش کیا جائے۔ کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے مقرر کردہ بی۔ایڈ تدریس اُردو کے لیے نصاب کی ضرورتوں کو بطور خاص ملحوظ نظر رکھا گیا ہے۔ ایسا کرنے میں مرتبین کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، اس کا اندازہ قارئین کی قیمتی آراء سے ہم کو ہو سکتا ہے۔“

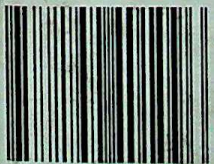
Guldasta-e-Urdu Tadrees

by

Prof. (Dr.) Qazi Ahmad Ullah

Prof. Sheikh Mohammad Yusuf

PRINT & DESIGN
AL-HAYAT
PRINTING PRESS
GAWDAL SGR #11940372



Published by :

TAKBEER PUBLICATIONS

Srinagar (Kashmir)

Cell : 9906662404

ISBN : 978-81-924010-9-6

CC-0. Agam Digam Digital Preservation Foundation, Chandigarh. Funding by IKS-MoE-2025-Grant